Acc No = 503619

imran

I Mohamd imran Mall

Roll NO = 43249 (380)
Sub = E - H - P - O

صنف الحشائش

فہرست

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	صنفِ انشائیہ ———		
	چند انشائیے ———		
۱	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ	محمد حسین آزادؔ	۲۵
۲	گلشن امید کی بہار	"	۳۵
۳	نہیں ...	عبد الحلیم شررؔ	۴۳
۴	ہم ...	"	۵۳
۵	آل کچھری ...	خواجہ حسن نظامی	۶۱
۶	جھینگر کا جنازہ ...	"	۶۵
۷	پٹنا ...	مرزا فرحت اللہ بیگ	۲۲۶
۸	مردہ بدست زندہ ..	"	۲۱۴
۹	قانونی زندگی ...	ملّا رموزی	۶۹
۱۰	غنودگی ...	"	۷۸
۱۱	ارہر کا کھیت ...	رشید احمد صدیقی	۸۶
۱۲	پاسبان ...	"	۹۸

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	چار سو بیس ...	حاجی لق لق	۱۱۴
۱۴	وہ آگئیں ...	〃	۱۲۲
۱۵	آنریری مجسٹریٹ ...	انجم مانپوری	۲۳۶
۱۶	دوستی ...	〃	۲۵۸
۱۷	کتّے	پطرس	۱۲۷
۱۸	سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	〃	۱۳۵
۱۹	مشینوں کی موت	فلک پیما	۱۴۷
۲۰	نئی دُکان ...	〃	۱۵۷
۲۱	غسلیات ...	کرشن چندر	۱۶۳
۲۲	رونا ...	〃	۱۷۱
۲۳	اخبار بینی ...	کنھیا لال کپور	۲۷۹
۲۴	اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے	〃	۲۸۵
۲۵	تکلفات ...	شوکت تھانوی	۱۷۹
۲۶	بابو ...	〃	۱۸۹
۲۷	موٹر سائیکل ...	شاہ علی اکبر قاصد	۲۰۰
۲۸	چھینک ...	〃	۲۰۵

عرضِ ناشر

زیرِ نگاہ مجموعہ مضمون کی ایک مخصوص صورت کا تعارف ہے اور اُس کا نمائندہ بھی۔ یہ صورت ادب کی ایک نئی اور دلکش صنف "انشائیہ" ہے۔

اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس سے پہلے اس صنف پر ایسی جامع، عالمانہ اور واضح نگاہ نہ ڈالی گئی تھی۔ انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر سیّد محمد حسنین کا بصیرت افروز اور پرمغز مقالہ ہمارے ادبی شعور کی ایک بند دریچی کھول دیتا ہے۔ اس مقالہ میں ادبی اور غیر ادبی تحریروں کی جیسی شناخت کرائی گئی ہے اور فن و معیار کی جیسی اہم قدریں مصنف نے ہمارے سامنے رکھی ہیں اسکا اندازہ اسکے مطالعہ سے ہو سکے گا۔

آج کے نئے لکھنے والوں کے لئے خصوصاً یہ مجموعہ چراغ راہ کا رکھتا ہے۔ جنھیں کچھ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے ان کے لئے یہ مجموعہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ بات یہ ہے کہ اردو میں افسانہ نگاری اور تنقید نگاری ترقی کے بہت اونچے مدارج طے کر چکی ہے۔ ان اصناف میں نومشقوں کے لئے

اب کوئی جگہ بنانی آسان نہیں۔ انشائیہ نگاری اس لحاظ سے قابل توجہ ہے
مغربی ادبوں میں LIGHT ESSAYS بہت ہی معروف ہیں اور وہاں
انشائیہ ادب کی ایک مقبول عام صنف میں شمار ہے۔ ہمارے نئے لکھنے والے
اگر انشائیہ نگاری کی طرف متوجہ ہوں تو اس صنف میں انھیں نام اور مقام
پیدا کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

یہ مجموعہ بی۔اے پاس اور آنرس طلبأ کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ امید ہے
کہ قدردان ادب اسے پسند فرمائینگے۔ اور یونی ورسٹیاں اسے اپنے نصاب میں
داخل کر کے ناشر کی ہمت افزائی کرینگی

دیوان چند

صنفِ انشائیہ

انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے۔ یہ اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب ایک مخصوص صنفی مقام کا مستحق ہے۔ ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے اور مختصر طور پر پیش کیا جائے، عام زبان میں "مضمون" سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظ کہانی میں ہے۔ ہر ایسی بات جس میں کوئی قصّہ بیان کیا گیا ہو، کہانی ہو جاتی ہے۔ یہ میر حسن کی سحر البیان ہو یا نذیر احمد کا ابن الوقت، سرشار کا فسانۂ آزاد ہو یا امتیاز علی کی انار کلی۔ پریم چند کا آخری تحفہ ہو یا سردار جعفری کی نئی دنیا کو سلام...... بنیادی طور پر یہ تمام تحریریں کسی قصّہ یا واقعہ سے متعلق ہیں۔ ان قصّوں کی نوعیت

گرچہ مختلف ہے مگر ان سب میں ایک بنیادی عنصر موجود ہے جو کہانی ہے اس لحاظ سے ان مختلف تحریروں کو کہانی سے موسوم کرنا حق بجانب ہے، مگر ادب کی اصطلاح میں ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ کہانی ہوتی ہوئی بھی یہ صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور آپ اس سے اتفاق کرینگے کہ ان میں سے ہر صورت کی ایک مخصوص صنفی حیثیت ہے۔

یہی حال مضمون کا ہے۔ لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول سا لفظ ہے۔ اسکے دائرے میں بہت ساری باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔ عزیز و اقربا کے نام خطوط، جلسوں کی رپورٹ، ادبی اور ثقافتی تقریبات کا آنکھوں دیکھا حال، کسی دلچسپ شخصیت کا مرقع، کسی سنجیدہ امر پر فکر انگیز خیالات کسی بڑے آدمی کی حیات کا ایک رخ، کسی روزنامے کا اداریہ، کسی روزنامچے کا ایک ورق، کسی موضوع پر ذاتی تاثرات۔ الغرض اسی نوع کی تمام باتیں جو اختصار کے ساتھ نثر میں قلمبند کردی جائیں بہ آسانی "مضمون" سے موسوم کردی جائینگی۔۔۔۔ لیکن ایک متعلم ادب کا ان مختلف ادبی تحریروں کو مضمون سے یاد رکھنا اس کی لاعلمی کا ثبوت ہوگا۔

انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے مگر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خبر و خیریت ملتی ہو یا روئداد کی خشک کارروائیوں کا حال۔ جس میں رپوتاژ کی پراثر طائرنہ نگاہی ہوتی ہو یا خاکہ کے دلچسپ جلووں کی بوقلمونی۔ جس میں مقالہ کی فکر خیز بصارت ہوتی ہو یا سوانح کا تاریخ دار مرقع۔ جس میں روزنامچہ کے غیر متعلق بے ربط بیانات ملتے ہوں، یا اداریہ کا کسی عنوان پر مسلک کے تحت عامیانہ اظہار خیال —— مراسلہ، روئداد، رپوتاژ، خاکہ، مقالہ، سوانح، روزنامچہ اور اداریہ وغیرہ بلاشبہہ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں لیکن ان میں چند شکلیں ایسی ہیں جو موضوع اور اسلوب کے بموجب اپنی خاص وضع و قطع رکھتی ہیں اور ان کی اپنی کوئی مخصوص صورت ہے۔ ایسی مخصوص صورت جس کی تعمیر یا تشکیل میں اصول، سلیقہ اور فن کا دخل ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ ایسی صورتیں ہیں جنھیں ہم اصناف ادب کا مرتبہ دے سکتے ہیں۔۔۔۔۔

ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے جس کا نثری ادب میں اپنا ایک صنفی مقام ہے۔ انشائیہ کو اس لئے مضمون جیسے گول لفظ سے موسوم کرنا بالکل نامناسب ہے۔ مضمون نویسی چھوٹے چھوٹے بچوں یا اسکول کے لڑکوں کا کام ہے۔ یہ شغل ادیب کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔

۱ انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت ہے یا صنف ہے۔ ادب کے مختلف اصناف میں اسکا رشتہ مقالہ سے قریبی ہے۔ کہانوی اصناف یعنی داستان، ڈراما، ناول، افسانہ اور مثنوی سے اس کا واسطہ نہیں۔ بہ اعتبار صنف اسکا موازنہ مقالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور بصیرت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف و شفاف ہوتی ہے۔ اسکی تیز شعاعوں سے نفس تحریر کے مختلف گوشے منور و نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوع تحریر یا نفس مضمون سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں ــــ انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ روشنی رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اس میں دھندلکا اور براقی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہماری توجہ کو ایک ہی راستہ پر نہیں لگاتیں بلکہ یہ اس سے اٹھکھیلیاں کراتی ہیں ــــ مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے ہیں یا کچھ پالیتے ہیں۔ ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گوناگون اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔ انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شئے پالیتے ہیں۔ ایسی شئے جو روزانہ کی سادہ و سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے جو زندگی کے ٹھوس اور

ناقابل انکار حقیقتوں اور صداقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔

آپ جانتے ہیں، یہ دنیا حیوانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں شیطانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن زندگی اور خوشگوار زندگی کو انسانوں کی حاجت ہے، اور انسان بن کر انسانیت کا اندازہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ یہ ہر کے بس کی بات نہیں۔ انسانی قدروں کی تمیز اور پہچان کے لئے دانائی کی ضرورت ہے اور یہ دانائی تھوڑی سی حیوانیت سے بڑے مزے میں حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انشائیہ بہت مفید ہے۔ یہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے جس سے ہماری انسانیت میں چستی اور توانائی آجاتی ہے۔

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے۔ اس سے ہم میں تہذیب و متانت آتی ہے۔ انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے۔ اس سے ہم میں رندی اور آوارہ خیالی آتی ہے۔ مقالوں کی سنجیدگی اور نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی آوارگی یا بدمستی ہی دور کر سکتی ہے۔ مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے اور انشائیہ میں تاثرات کا۔ مقالوں کا کام تفکر خیزی ہے اور انشائیوں کا کیف انگیزی۔

مقالہ نگار ایک معلّم ادب ہوتا ہے۔ اس کا کام درس و تدریس ہے

اس کی باتیں عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں۔ وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔ اس میں متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے۔ اس کا شیوہ لفاظی نہیں۔ وہ جو جانتا ہے کہتا ہے اور جتنا جانتا ہے سناتا ہے۔ وہ ہمیں گمراہ نہیں کرتا.... انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے۔ وہ غیر سنجیدہ بات کہتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ سے کہتا ہے۔ وہ جتنا نہیں جانتا اس سے زیادہ سناتا ہے۔ لیکن اس کی باتیں عبث ولاحاصل بکواس نہیں۔ یہ مفید اور کار آمد ہیں۔ یہ ہماری فہم وادراک کو منجمد اور سپاٹ ہونے سے بچاتی ہیں۔ ان سے ہمارے طائر تخیل کو پر لگتے ہیں۔ انشائیہ نگار کی گپیں ہماری قوت تمیز پر ٹھوکریں لگاتی ہیں۔ یہ ہم پر ان تازیانوں جیسا کام کرتی ہیں جن کی نرم چوٹیں سہکر ہم زیادہ ہوش مند زیادہ روشن خیال اور زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔

مقالہ اور انشائیہ دونوں نثری ادب کے اصناف ہیں۔ مگر مقالوں کی روحانی تربیت ادب سنجیدہ انجام دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے۔ اسکے برخلاف انشائیوں کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمہ رہتا ہے۔ اس جگہ ادب لطیف اور ادب سنجیدہ کا بیان ضروری ہے۔

ہر زبان وادب کے دو حصّے ہوتے ہیں، ادب لطیف اور
ادب سنجیدہ، جنھیں انگریزی میں LIGHT LITERATURE اور
SERIOUS LITERATURE. کہتے ہیں۔ ادب لطیف میں شعری اور نثری
اصناف داخل ہیں۔ اور ادب سنجیدہ میں علوم اور سائنس۔ شاعری، داستان،
ناول، ڈراما، افسانہ، خاکہ، مقالہ، انشائیہ، رپوتاژ وغیرہ ادب لطیف
کی مختلف صورتیں ہیں۔ عمرانیات، اخلاقیات، معاشیات، نفسیات،
فلسفہ و تاریخ وغیرہ کا تعلق علوم سے ہے اور طبعیات، فلکیات،
نباتیات، حیاتیات وغیرہ کا سائنس سے۔ یہ سارے مضامین اپنی سنجیدگی
اور سنجیدہ بیانی کے بموجب ادب سنجیدہ میں شمار ہوتے ہیں ....
ادب لطیف زبان وادب کا وہ حصّہ ہے جس میں علوم و سائنس کا گذر
نہیں۔ یہ انسان، مہذب و متمدن انسان کی وہ حسّی و ذہنی تحریری
کاوشیں ہیں جو تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں جن میں نہ علوم و سائنس جیسی
سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ ان کی جیسی خشک بیانی۔ یہ باتیں لطیف
و نازک ہوتی ہیں اور یہ ہمارے دل و دماغ سے سنجیدگی کی طالب
نہیں ہوتیں۔ یہ براہ راست ہمارے احساس کو چھوتی ہیں اور ہمیں
نت نئے کوائف سے ہم کنار کر دیتی ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ادب لطیف کسی ادب کا ایک حصّہ ہے

یہ تحریر کی کوئی خاص صورت نہیں ۔ لیکن عام طور پر اسے ایسا نہیں سمجھا جاتا۔ ادب لطیف سے مراد ایک خاص رنگ اور لب و لہجہ کی تحریریں لی جاتی ہیں جو "نیارنیت" یا "ٹیگوریت" کی مثال ہوتی ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو اپنی ساری جمالیاتی قدروں کے ساتھ نثر میں قلمبند کی جاتی ہے۔ یہ کسی شدید داخلی پُر از ہیجان کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ روح اور قالب یعنی موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ تحریریں بے حد رومانی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ ایک زمانہ میں اس نوع کی تحریریں ہمارے ادب میں بڑی مقبول تھیں اور یہ انشائے لطیف یا ادب لطیف جیسے ناموں سے معروف تھیں۔

بلا شبہ یہ تحریریں اپنے مخصوص لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ کے بموجب اپنی ایک خاص شکل یا صورت رکھتی ہیں۔ مگر یہ تحریریں اگر صنفی لحاظ سے ادب میں ان کو کوئی مقام دیا جاسکتا ہے، بے نام و نشان رہیں۔ دیگر اصناف ادب مختلف ناموں سے نامزد ہوئے پر ان کا کوئی نام نہ پڑ سکا۔ اپنے نو مشق قلم کاروں کے ہاتھوں یہ بدنام رہیں اور گمنام مریں۔ آسانی کے لئے ان تحریروں کو ہم کیفیہ سے یاد رکھینگے۔ اکبر حیدری کی کیفستان حجاب اسماعیل کی نغمات موت اور آصف علی کی پرچھائیاں اور اس کا دوسرا رخ، ان تصنیفات میں ہیں جو کیفیہ کی مثال ہیں۔۔۔۔۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کیفیہ وہ

خوش رنگ پھل تھا جو پکنے سے پہلے سڑ گیا۔

تو کیفیہ کو ادب لطیف سے موسوم کرنا حماقت ہے۔ فی زمانہ یہ ایسی ہی مضحکہ خیز بات ہے جس طرح نظموں یعنی POEMS کو POETRY سے موسوم کرنا۔ شاعری کسی زبان و ادب کا ایک پہلو یا حصہ ہے اور اس حصّہ میں کئی شعری صورتیں ہیں جن میں نظم ایک مخصوص صورت ہے۔ اسی طرح ہر مہذب و متمدن قوم جو اپنا ایک لسانی وجود رکھتی ہے اسکا اپنا ایک قومی اُدب ہوتا ہے۔ اس ادب کی دو شاخیں ہوتی ہیں ادب لطیف اور ادب سنجیدہ۔

ادب لطیف میں وہ تمام شعری اور نثری تحریریں داخل ہیں جو تاثرات کا نتیجہ ہیں جن میں احساسات، جذبات و تخئیل کی کارفرمائی ہے اور جو تجربہ و مشاہدہ کا حاصل ہیں۔ یہ تحریریں اپنی مخصوص وضع و قطع یا صورت رکھتی ہیں اور ہم انھیں اصناف ادب یعنی LITERARY FORMS کے نام سے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں ان ہی اصناف میں ایک صورت ان رومانی تحریروں کی ہے جنھیں میں نے کیفیہ کا نام دیا ہے اور جو نثر کی شاعری ہے ـــ ادب لطیف سے مراد صنف کیفیہ نہیں بلکہ زبان و ادب کا وہ حصّہ جس کا دوسرا حصّہ ادب سنجیدہ ہے، جس کی دو شاخیں نثر اور شاعری ہیں اور جس میں کئی نثری اور شعری اصناف ہیں۔

مقالہ اور انشائیہ کا موازنہ کرتے ہوئے میں نے کہا ہے کہ مقالوں کی تربیت ادب سنجیدہ انجام دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ مقالوں میں روح ادب سنجیدہ سے آتی ہے اور قالب کی مٹی ادب لطیف سے لائی جاتی ہے۔۔۔۔۔ اِس بات کو اس طرح سمجھئے۔

مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ حکمت و فلسفہ یا علم و دانش اور سائنس کے کسی پہلو یا رُخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اس کے دائرے میں ادب سنجیدہ کے عالمانہ حکیمانہ اور فاضلانہ امور کے لئے پوری گنجائش ہے۔۔۔۔۔ یہ باتیں یا اس نوع کی باتیں بڑی اہم ہیں۔ ان سے ہماری شناسائی ضروری ہے ان کی بے کیفی، خشکی یا دشوار فہمی کا اندازہ کرتے ہوئے ہم ان سے گریز نہیں کر سکتے۔ آپ اس سے اتفاق کرینگے کہ علوم اور سائنس سے ہماری لاعلمی ہمارے عقل و ادراک کو فنا کر ڈالے گی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص ان سے بے تعلق ہو کر وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار و ترقی سے یقیناً بے تعلق ہو جائے گا۔۔۔ مقالے اچھے اور مفید مقالے اس اہم مقصد میں ہمارے بڑے کام آتے ہیں۔ یہ ہمیں وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار اور ترقی کے ساتھ لے چلتے ہیں۔ ایک مثال سے

یہ بات اچھی طرح روشن ہو جائے گی۔

آج روس کا اسپوتنک انسان کی ذہنی کاوش کا ایک سب سے حیرت ناک اور جیتا جاگتا کرشمہ نظر آتا ہے ـــــ ہم سے سینکڑوں میل کی بلندی پر کرۂ ارض اور قمر کے درمیان نیلگوں خلا میں انسان کا بنایا ہوا چند انچ کا یہ ننھا سا مصنوعی چاند قدرت کے دیگر اجسام فلکی کی طرح اپنے مدار پر گردش کر تا رہا ہے۔ کتنی استعجاب انگیز اور عقل میں نہ سمانے والی بات ہے یہ ـــــ!

لیکن یہ بات ایک ٹھوس حقیقت ہے اور عقل کو اسے سمجھانا ضروری ہے۔ ہم روس کے اسپوتنک کو ماہ نخشب یا جام جمشید جیسی تخیلی پیداوار قرار نہیں دے سکتے۔ ایسا خیال کرنا ہماری جہالت کی دلیل ہوگی۔ انسانی دماغ اس حیرت ناک ایجاد کو سوچ سوچ کر حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غوطے لگا رہا ہے۔ انسان کی پھٹی پھٹی نگاہیں اس مصنوعی چاند کی ایک جھلک دیکھنے کو نہ جانے کتنی بار آسمان پر بے تابانہ اٹھی ہیں۔ ہمارا ہوشمند دماغ اس عینی صداقت کو سمجھنے کے لئے پریشان اور بے کل رہا ہے۔

یہ کیسا چاند ہے؟ کس طرح یہ گردش کر رہا ہے؟ کون سی طاقت نے اسے سطح زمین سے سینکڑوں میل کی اونچائی پر پہنچا دیا؟ اس میں ایک ذی حیات مخلوق کیونکر زندہ رہی؟

بینائی سے روپوش ہوکر بھی کیونکر بہ انسانی قوت مشاہدہ سے روپوش نہ ہوسکا؟۔ اس قسم کے سوالات، عقل میں نہ سمانے والے بے شمار سوالات ہمارے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔

ایسے موقع پر ایک سادہ سا علمی مقالہ ہماری آسودگی کا سبب ہوتا ہے۔ طبیعات، فلکیات اور دیگر متعلقہ سنجیدہ اور سائنٹیفک مضامین کے پس منظر میں اس موضوع پر ایک مختصر سی تحریر انسان کے اس مصنوعی چاند کے تعارف کے لئے کافی ہوگی —— اس تحریر کے مطالعہ سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جانا یقینی ہے۔ اسپوٹنک پر ایک اچھا سا معلوماتی مقالہ ہمارے دماغ کی ایک بند دریچی کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

آپ خود غور کریں، اس نوع کی تحریر ہمارے لئے کتنی مفید ثابت ہوگی —— ایک ناقابل فہم اور دشوار بات جو بے حد سنجیدہ ہے، سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ یہی سنجیدگی مقالہ کی روح ہوتی ہے۔ مقالوں میں یہ روح ادب سنجیدہ سے آتی ہے۔ ادب سنجیدہ ہی مقالوں کے نفس میں حرارت دیتی ہے۔ ہاں ان کے قالب کی مٹی ادب لطیف سے لائی جاتی ہے۔

مقالوں میں حکمت و فلسفہ، علم و دانش یا سائنس کی باتیں

سپردقلم کی جاتی ہیں مگر اس سپردگی میں عالم، حکیم یا سائنٹسٹ کی روش نہیں اختیار کی جاتی۔ مقالوں کا انداز بیان دشوار اور ناقابل فہم نہیں ہوتا۔ یہاں باتیں علوم و سائنس کے عجیب و غریب اشارات اور وضع و مصطلحات کے بل بوتے پر نہیں چلتیں بلکہ یہ ادب لطیف کا سہارا لے کر قدم بڑھاتی ہیں۔ ان کی بے کیفی، خشکی اور سنجیدہ بیانی پر مجاز و تمثیل کا ہلکا سا چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے۔ ان چھینٹوں سے تحریر میں ترو تازگی، فرحت اور پذیرائی آجاتی ہے۔ یہ مقالوں کی زبان اور اسلوب کا سبب ہے کہ ان دشوار و ادق باتوں کو بلا دردسر ہم ذہنی طور پر بڑے مزے میں قبول کر لیتے ہیں۔

یہ مثال ایک علمی مقالہ کی تھی جس کی روح سائنس کے چند اونچے نکات سے معمور تھی۔ اسی طرح دیگر سنجیدہ امور بھی مقالوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ ملک کا دوسرا پنج سالہ پلان ہو یا کالجوں میں جنسی تعلیم کی اہمیت۔ ڈی وی سی کے زرعی امکانات ہوں یا نظریہ حیات بعد الموت۔ نالندہ کی ثقافتی زندگی کا ایک رخ ہو یا اشتراکیت میں انفرادی آزادی۔ یہ یا اس قسم کی کوئی بات مقالوں کا موضوع ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ادب، فن، شاعری اور تنقید جیسے ادبی امور بھی بخوبی مقالوں میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ذی علم اہل قلم ان

عنوانات پر سیر حاصل بحث کر سکتا ہے۔ ذی علم سے مراد خواندہ محض نہیں بلکہ ایسا شخص جس کی ان دشوار اور ادق باتوں پر اچھی خاصی نگاہ ہے اور جس کا اپنا مطالعہ ہے۔ اس کے مطالعہ میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہوگی اسی قدر مقالہ میں وزن اور استحکام ہوگا۔

اچھے مقالہ نگار کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ اسکی عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج۔ اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔۔۔۔۔ بڑے اور فاضل مقالہ نگار کی شخصیت کا پہلا رخ عالم کا ہوتا ہے اور دوسرا انشاء پرداز کا۔ وہ صرف بلند و اعلیٰ اور اہم و ادق سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا بلکہ اسے عام فہم اور دل نشین انداز سے قابل قبول بنا کر کہتا ہے۔

انشائیہ نگار کا دماغ اور زبان دونوں شاعر کی ہوتی ہیں۔ یہ عارف عرش نشین ہی نہیں ہوتا بلکہ ساقی محفل خاص ہوتا ہے۔ اسکی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہ ادب لطیف کی خاک سے ہوتا ہے اور اسی کی خاک اڑاتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ ادب سنجیدہ کی سرحد اس کے لئے

آوٹ آف باؤنڈ ہوتی ہے یا فلسفہ و حکمت اور سائنس کے پاس اس کا پھٹکنا بھی محال ہے۔ وہ کاخ ادب کے ہر حصہ میں داخل ہوسکتا ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ آزاد و خودمختار ہے۔ ہاں، ان مقامات میں اس کے لئے ٹھہرنا دشوار ہے۔ وہ صرف ان کی جھلکیاں لے سکتا ہے۔ اسکی نگاہوں کا ادب سنجیدہ کی، صداقتوں اور حقیقتوں سے ہمکنار ہونا ناممکن ہے۔

انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ HE CAN CATCH HOLD OF ANY THING AND CAN MAKE SOME-THING OUT OF NOTHING. چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات، ہر ادا اور ہر کیفیت اسکی زد میں آسکتی ہے۔ اپنی افتاد طبع اور ندرت بیانی سے وہ ہر بے بات کی بات میں "کچھ بات" پیدا کر دے سکتا ہے۔ آپ کہینگے کچھ بات پیدا کر دینا ایک اچھے صحافی کے لئے بھی کوئی دشوار بات نہیں۔

مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ بے بات کی بات پیدا کر دینا یا بات کا بتنگڑ بنا دینا صحیفہ نگاری کا ایک وصف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صحافی بھی موضوع کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے اور بڑے اطمینان و اعتماد کے ساتھ کسی موضوع پر موثر انداز میں بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ نگار کی طرح وہ بھی یقیناً آزاد ہے۔

مگر دونوں میں فرق ہے اور بنیادی فرق ہے۔ انشائیہ نگار کا
ضمیر پاک ہوتا ہے۔ صحافی کے یہاں یہ طہارت نفس ممکن نہیں۔ اس کی
تحریروں پر ایک چھاپ ہوتی ہے جو کسی مسلک یا پالیسی کی چھاپ
ہے۔ یہ چھاپ ہلکی ہوتی ہے اور اثر بخش۔ اداریئے اور شذرات میں
دوسروں کو ہم خیال و ہم مشرب بنالنے کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔
انشائیہ میں یہ وصف نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار کا اپنا کوئی سوچا سمجھا
مسلک نہیں ہوتا۔ یہ کسی پالیسی کا اسیر نہیں۔ یہ بالکل آزاد رہتا ہے اور
خود مختار۔ اسکی قلم کاری پر کوئی سنسر نہیں۔

صحیفہ نگار کی باتوں میں سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی ہوتی ہے۔
مگر یہ باتیں عامیانہ اور سطحی ہوتی ہیں۔ ان میں مقالہ جیسی گہرائی
یا پائیداری نہیں ہوتی۔ اچھا صحافت نگار جیک آف آل ہوتا ہے
ماسٹر آف آل نہیں ہوتا۔ اچھا مقالہ نگار ماسٹر آف ون ہوتا ہے جیک
آف آل نہیں ہوتا۔ یہ کنواں جیسا گہرا ہوتا ہے، پھیلا ہوا پانی نہیں
ہوتا۔ انشائیہ نگار بھی جیک آف آل ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر عنوان پر قلم
اٹھا سکتا ہے مگر اس کی باتوں میں نہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ اس پر
کوئی چھاپ رہتی ہے۔ اچھا انشائیہ نگار ایک بہتا ہوا دھارا ہے
رواں، دواں اور جولاں۔

صحافی بھی مقالہ نگار کی طرح دعوت فکر دیتا ہے۔ مگر اس کی

باتوں میں کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان میں دینے کے ساتھ لینے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ صحافت نگار بے غرض و بے مطلب قلم نہیں اُٹھاتا اور نہ دیانت کے ساتھ قلم چلاتا ہے۔ یہ اپنے کام کی بات لکھتا ہے۔ یہ باتوں میں کثر بیونت کو جائز اور خورد و برد کو روا قرار دیتا ہے۔ اس کے برخلاف مقالہ نگار کو دیانت سے واسطہ رکھنا ہوتا ہے۔ اغماز اس کی عادت نہیں ـــ انشائیہ نگار ہمیں دیتا ہے ہم سے کچھ مانگتا نہیں۔ اس کی باتوں میں سوال یا طلب کا لہجہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں آسودگی اور راحت بخشتا ہے۔

الغرض انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ بالکل آزاد و خود مختار ہوتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ ہر جگہ جا سکتا ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ شرط کیف و اثر ہے کیونکہ بات کا بتنگڑ بنانا اس کا کام نہیں۔ اسے دل سے سروکار رکھنا پڑتا ہے، دماغ یا "دماغ والوں" سے نہیں۔ وہ کوائف بخشتا ہے' افکار نہیں دیتا۔ وہ گپ کرتا ہے درس نہیں دیتا۔ وہ دل بہلاتا ہے مسلک و آئین کی تبلیغ نہیں کرتا۔ اس کا کام خوش گفتاری ہے۔ اس کا طائر آزاد و پر فشاں رہتا ہے۔

سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر دینا اور غیر سنجیدہ کو سنجیدہ بنا دینا معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کے

نیرنگیٔ نظر کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ... وہ پارلیمنٹ کو ارہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کی نواہائے سمع خراش کو طرحی غزلیں۔ وہ اسپٹنک کو محبوبۂ تقویٰ شکن کی ڈولی بتا سکتا ہے اور خوش نصیب لائیکا کو جنرل ڈی گاؤلے۔

انشائیہ کی شریعت میں "کہانویت" کفر ہے۔ ادب لطیف سے متعلق ہوتے ہوئے بھی یہ صنف کہانوی اصناف سے بے تعلق ہے۔ پلاٹ اور کردار جیسے اجزائے ترکیبی کا استعمال انشائیہ میں ممنوع ہے۔ داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی کی تعمیر، ماجرانگاری اور سیرت نگاری کی حاجت مند ہے مگر اس صنف میں انکا استعمال ناجائز ہے۔

انشائیہ نگار قصّہ گوئی نہیں کرتا۔ یہ کوئی دلچسپ یا غیر معمولی واقعہ نہیں سناتا۔ اس مقصد کے لئے ناول، داستان اور ڈراما جیسے اصناف موزوں ہیں۔ وہ واقعہ کے ٹکڑوں سے جنھیں محاضرات یعنی ANECDOTES کہتے ہیں مصرف لے سکتا ہے مگر ان کے استعمال سے وہ تعمیر قصہ نہیں کرتا بلکہ باتوں کے انتشار میں اضافہ کر دیتا ہے۔ محاضرات کے پیچھے جو نوع در نوع ہلکے پھلکے اثرات ہوتے ہیں ان کے مصرف سے انشائیہ کی رنگارنگی میں تیزی پیدا کر دی جاتی ہے۔ لطیفوں اور

چٹکلوں سے اس میں نکھار آجاتا ہے ۔ انشائیہ بذات خود لطیفہ یا چٹکلہ نہیں ۔۔۔

اسی طرح اس صنف میں سیرت نگاری کا بھی گذر نہیں تخلیق شخصیت یا مرقع نگاری انشائیہ نگار کا کام نہیں ۔ اس مقصد کے لئے ہمارے سامنے خاکہ نگار کی ذات آتی ہے ۔ انشائیہ میں شخصیت یا انفرادیت کے نقوش وجلووں سے کام نکالا جاسکتا ہے مگر انھیں مرکزی مقام نہیں دیا جاسکتا ۔ یہ نقوش وجلوے ذیلی ہوتے ہیں ۔ انشائیہ میں ان کا امتیازی وجود نہیں ہوتا ۔

بات یہ ہے کہ کہانوی اصناف میں کوئی مادہ یا بنیادی خیال ہوتا، جسے THEME کہتے ہیں ۔ ہر افسانہ ، ناول ، ڈراما یا مثنوی میں کسی نہ کسی بنیادی خیال کا ہونا ضروری ہے جو تصنیف کے مطالعہ کے بعد ہم پر روشن ہو جاتا ہے ۔ یہی بنیادی خیال ان اصناف کے موضوع اور اسلوب کے بموجب ان کی صنفی صورت قائم کرتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ واقعہ نگاری یا سیرت نگاری میں ایک ایکائی ہوتی ہے جن سے تحریروں میں کوئی واقعہ یا سیرت پیش کی جاتی ہے ۔ ان میں ایک داخلی رشتہ ہوتا ہے لیکن انشائیہ میں یہ ایکائی یا داخلی رشتہ یا بنیادی خیال نہیں ہوتا ۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اس کی کامیابی کا سبب تاثرات کی وحدت و

اتحاد نہیں، ان کی بوقلمونی ہے۔
باتوں کے ربط، ترتیب اور اتفاق سے کہانوی اصناف کو مجموعی طور پر ایک بھرپور، منظم اور مکمل صورت مل جاتی ہے۔ صنف انشائیہ کی دلکشی کی اصلی وجہ اسکی بے ربطی و بے ترتیبی ہے۔ اچھا اور نفیس انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

انشائیہ میں داخلیت یعنی SUBJECTIVITY ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔ یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ خارجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی ہے۔ اس کی ادائگی کے لئے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا، بلکہ پرائے دل و دماغ کے پاس بھی جا پہنچتا ہے۔ اس کی باتیں رنگا رنگ ہوتی ہیں۔ یہ ذاتی ہوتے ہوئے بھی ہمہ گیر ہوتی ہیں۔ ان میں داخلی تاثرات اور خارجی بیانات کا بڑا خوشگوار امتزاج ہوتا ہے۔
داخلیت کیفیہ میں بھی ملتی ہے مگر یہ تیز اور براق ہوتی ہے۔ یہ براہ راست قلب تک اتر جاتی ہے اور روح میں ایک لذت آگین

اضطراب اور لطیف کسک پیدا کر دیتی ہے۔ انشائیت کی داخلیت صرف دل کو نہیں چھیڑتی بلکہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے۔ انشائیہ اور کیفیہ دونوں اصناف اپنی نوعیت کے بموجب تاثراتی ہوتے ہیں لیکن اول الذکر میں دھوپ چھاؤں کی بہار بھی رہتی ہے اور لیل و نہار کا لطف بھی اور کیفیہ میں صرف سحر کا سماں رہتا ہے یا تاروں کی تنک تابی۔

کیفیہ میں ایک ہی ذائقہ ملتا ہے مگر انشائیہ سے وہ خمار میسّر ہوتا ہے جس کی لہریں چڑھتی اور اترتی رہتی ہیں۔ کیفیہ نثر کی شاعری ہوتی ہے جس میں انگریزی صنف شاعری BALLAD جیسی بات ہوتی ہے۔ انشائیہ نثر کی غزل ہے جس کا ہر جرعہ ایک نیا کیف و سرور بخشتا ہے۔

اس صنف کو مزاح نگاری سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگاری کو مزاحیہ نگاری قرار دینا بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ مزاح نگاری، ہجو نگاری المیہ نگاری یا رومان نگاری قلم کار کی کاوش کے مختلف رنگ ہیں۔ یہ قلم کاری کی ادائیں ہیں، تحریر کی صورتیں نہیں۔ ادبی نگارشات میں ان کا وجود توصیفی ہوتا ہے صنفی نہیں۔

تحریروں کا اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب کوئی خاص صورت اختیار کر لینا ایک بات ہے اور ان میں کسی خاص رنگ کا پایا جانا اور بات ہے،

ادبی تحریروں کو ہمیں صنفی لحاظ سے دیکھنا چاہیئے اور "ادب پارہ" یا اصناف ادب سمجھ کر جانچنا اور پرکھنا چاہیئے۔ تحریروں کی ادبی شناخت کی یہ پہلی منزل ہے۔ افسوس ہے اگر ہم اس بنیادی بات سے ہی لاعلم ہیں!

مزاح نگاری ایک رنگ ہے صنف نہیں ہے۔ یہ قلم کار کی کاوش کی ایک خصوصیت ہے، ادب پارہ نہیں۔ یہ رنگ یا وصف نثری میں بھی پیش کیا اور شعری اصناف میں بھی —— صنف انشائیہ میں دو قسم کے رنگ استعمال کیے جاتے ہیں، ظرافت اور طنز۔ اس میں درد و الم اور حزن و یاس کا استعمال جائز نہیں۔ یہ رنگ صنف کیفیہ کے لئے موزوں ہیں۔

انشائیہ نگاری کے لئے ظرافت نگاری لازمی ہے۔ ظرافت اس کا ایک شوخ اور چٹکیلا رنگ ہے۔ اس کی زعفران زار سرزمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب مواقع ملتے ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا بڑا عام ہے مگر اپنے پر دوسروں کو ہنسانا آسان نہیں۔ اس کے لئے ہمت اور تھوڑی سی قربانی کی ضرورت ہے۔ انشائیہ کی نیرنگی دوسروں کی حماقت اور اپنی خفّت دونوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بیک نگاہ یہاں آنکھوں کے تنکوں کے ساتھ بڑی بڑی شہتیریں بھی سامنے آجاتی ہیں ...... اچھے اور شگفتہ انشائیہ سے اصلی ہنسی اور

کھسیانی ہنسی دونوں میسر ہوتی ہیں۔

ظرافت اور طنز سے انشائیہ کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ انشائیہ کے وہ رنگ ہیں جن سے اس کی فضا میں دُھر کھیلی برپا ہوجاتی ہے۔ یہ دھول خیالات سے اڑائی جاتی ہے۔ یہ دھول دھپا کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ظرافت کے لئے بالغ ذہن، نفیس طبعیت اور شائستہ مزاج کا ہونا شرط ہے۔ ورنہ ظرافت میں بھانڈپن اور سوقیت پیدا ہوجائے گی۔ نفیس ظرافت، نامطابق خیالات سے پیدا کی جاتی ہے نامطابق واقعات سے نہیں پیدا کی جاتی۔ انشائیہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنا دیتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر سینگ لگا کر لاتیں چلانی قابل تعریف نہیں بلکہ سینگوں کے بغیر بیل بن جانا یا بنا دینا قابل تعریف ہے۔ اچھے انشائیوں میں ظرافت کے رنگ پختہ اور دور رس ہوتے ہیں۔ یہ بلند پایہ ہوتے ہیں اور ایسے اعلیٰ اور لطیف کہ ہنستے ہنستے ہم کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں۔

ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے۔ صنفی اور فنی لحاظ سے ہمارے یہاں یہ "ادب پارہ" نیا ہے اور قابل تعارف۔

انگریزی ادب یہ معروف عام ہے۔ انگریزی تعریفوں میں جانسن کا فقرہ بہت موزوں ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "IT IS A LOOSE SALLEY OF MIND" یعنی انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے، آزاد و خوشگوار ------ لفظ "ترنگ" انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ روح جس میں جولانی ہے مگر گرمی نہیں۔ جس میں انتشار ہے مگر پراگندگی نہیں۔ وہ روح جو دل سے زیادہ دماغ کو چھیڑتی ہے۔

انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی۔ یہ ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں آپ بیتی اور پرائی بیتی دونوں کا لطف ہوتا ہے۔ یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی ایک پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

"سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ"

عہد قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہسواری، تیر اندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیر اندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی۔ مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے۔ اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیوزاد آگران کے دلوں پر شیشۂ جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اسکی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا بری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کرکے جاہلوں کو پھنساتا ہے جب لقمہ رزق کا پاتا ہے اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکرو دغا انکی چاٹ لگ جاتی ہے

اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے غرض بہت کم انسان ہونگے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہردم ثابت قدم بنے رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے والے بھی ضرور ہیں کیونکہ خوشامدیں کی دُکان میں آج موتی برس رہے ہیں۔ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا۔ اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار امید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبّت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک۔ انہیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمودئے گدھوں کے دعوے بل ڈاگ کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں کچھ امید، کچھ ڈر، کچھ مروت سے غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دور دور تک پھیل گئی ہے بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی خود اس مردار سے متنفر ہیں۔ وہ اس کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے چنانچہ جب کسی شئے پر دل آجاتا ہے اور سچ اسکے برخلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں اور اُس کان نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اسکی نصیحتیں کی ہیں تاکہ لوگ اُسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوفہ نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اسکی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت دوام کا تاج مرصّع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ جاؤ اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ

عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس پرست اس کی ماں تھی۔ اگرا سے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی مگر جب کبھی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ القاقاً اُس دن وہ بھی آیا ہوا تھا۔ اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعوے دار نئے ملک اور نئی رعیّت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے تو چونکہ بزرگان آسمانی کو انکی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں انکی لڑکی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے، اُٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اسی واسطے بلند اُٹھی، اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے فتح و اقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی

مگر استقلال رکاب پکڑے تھا اور جو قدم اُٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اسکے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا تو بھی وضع اسکی گھبرائی ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اسکے ساتھ لئے تھیں اور چونکہ یہ انکی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا اکثر ڈرتا تابعداروں کی طرح انکے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اسکی بے معنی تھیں اور کام بھی اُلٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا تھا مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اسکے یار و وفادار تھے۔ اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اُس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے سر پر بادل کا دھواں دھار بگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کا حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما

تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود اسکے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی بادہوائی، اٹکل پچّو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دم بدم جگہ بدلتا تھا کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا۔ اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک بے حیائی کی ڈھال منھ پر لیے ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جاکر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا بکھرے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں زخم جلد بھر آتے تھے۔ اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی

اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں اسلئے دھوکہ بازی اور شبہہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک سڑک تیار کرو مگر اس طرح کے ایچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہ راہ صداقت جو خط مستقیم میں ہے اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اِسی رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنے شروع کر دیئے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا تھا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے اور جب ملکہ لشکر آتا تھا تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑینگے مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کرکے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا، اُدھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوتی تھی تو سمجھتی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہونگے۔ جو بات سنیں گے اُسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گذارہ بھی

مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی۔ مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری نہ تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بد عملی ہو گئی۔ کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کہ اپنے مقابلہ پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری و بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کے نام نہ پاتی تھی تو گھٹتی تھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے ناامید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجئے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں انھیں میں رہا کریں۔ اپنے کئے کی آپ سزا پالیں گے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا۔ اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہان اندھیرا اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی۔ ساتھ اسکے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی

اس میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے :۔

(۱) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں روائی میں ہر دلعزیزی نہیں۔

(۲) کیا تدبیر ہے جس سے اسکے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو۔

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے۔ جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اسکی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دوراندیشی اور صلاح دقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہیئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہو گا لوگ اسکی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کرینگے کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اسکے برخلاف ہے۔ اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اسکی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں

انہیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔
دوسرے وہ خود بہروپیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھائے وہی روپ
بھر لیتا ہے اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن
نے صلاح کر کے ملکہ کے طرز لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک
ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور
وہ پہن کر لوگوں کو جُل دیا کرتا تھا۔ اس جامہ کا مصلحت زمانہ نام ہوا
چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جب ملک میں
پہنچتی اور آگے کو رستہ مانگتی ہوا وہوس حاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہ دیوزاد
سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گذرانتے۔ ادھر اسکا دخل ہوا ادھر ادراک
آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اترتے ہی اسکی اصلی روشنی اور
ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔
چنانچہ اب یہی وقت آگیا ہے یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ
آمیزی کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کیلئے مضر سمجھنے
لگتے ہیں اگر سچ کہیں پہنچکر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہی تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق
کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا
ہے تو وہ لفافہ اتار کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہی کہ
جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

نیرنگ خیال

گلشن امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں مگر زمین جس قدر تخم امید کو پرورش کرتی ہے اُسی کثرت سے کسی کیفیت کو سر سبز نہیں کرتی اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اٹھتی ہیں یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں انکے اثر ظاہر ہوتے ہیں مگر امید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بد حال بھی ہو سکتی ہے اسی وقت سے اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ امید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک تصویر

سامنے کھینچ دیتا ہے جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات پہنچ جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائینگی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حالت میں ضروری ہے۔ یہ وہ ضروری شئے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت میں بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو ایک دم گذارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے ۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار

پر امید وصل پہ برسوں گوارا ہو گیا

اس میں بھی شک نہیں کہ امید دھوکے بہت دیتی ہے اور ان باتوں کی توقع پیدا کر دیتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی ہوتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔ میں ایک رات انھیں خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا

ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانۂ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے امید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے، یکایک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے۔ ہر چمن رنگ و روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سر تا پا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے، چمکیلے پھول کھلے ہیں۔ آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں مگر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات

نظر آیا یعنی کہ دیکھا سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا چنانچہ قدم اٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا کیونکہ جو ہریادل سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچکر اس کی رنگت پھیکی پڑگئی اور میوے تو گرہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہونچا تھا اور جو بہاریں تھیں وہ ہر قدم پر سامنے ہی تھیں مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوق آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہوگیا مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلتے چلو۔ جو نعمتیں ڈہکا رہی ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ میں آئینگی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا جس میں زن و مرد، خورد و کلاں بہت سے آدمی اچھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں۔ یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے منھ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی

ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اس کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزومند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انھیں اسکے بجھانے کی بھی فرصت نہیں۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتا گیا۔ آخر ایک بوڑھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہوسکتا تھا میں نے خیال کیا کہ بوڑھے کو اب کیا ہوس ہو گئی ہے۔ اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے تیوری بدل کر منھ پھیر لیا اور کہا "صاحب دق نہ کیجئے" آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البال سے مالا مال ہو جائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار بیچارے ٹیکس اور محصول کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں وہ بھی بازو ڈال آرام سے بیٹھ جائینگے۔

میں نے بوڑھے کو اسکی خشکی دماغ کے حوالے کیا اور وہیں ٹھہر گیا
اتنے میں ایک شخص سامنے آیا جس کی ملائمیت شکل اور آہنگی
رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے مگر جب میں
اسکی طرف بڑھا تو اُس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا" اگر
آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اسی
خوشی کا ہوش نہیں کیونکہ بیس برس سے میں ایک عہدے کی امیدواری
کر رہا تھا اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے"۔ میں نے اسے بھی چھوڑا اور
ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ
کرے کیونکہ اسکی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے
ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا تھا۔ اس نے
ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اسکے دریائے منافع میں
ایک غوطہ مارا چاہتا تھا۔ یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام
ہی ہاتھ آجائے۔
ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے
معلوم ہوا کہ وہ طول البلد اور عرض البلد کے خیالات پھیلا رہا ہے
اور سرکار عالم سے انعام کا امیدوار ہے۔
جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو یہ سوچا کہ اوروں سے دریافت
کرنا بے حاصل ہے اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو

اور آپ دیکھو کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر
آیا اور آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اُسے دیکھ کر
دِل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیئے۔ چنانچہ
معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا، صاحب
جہاں آپ کھڑے ہیں یہ ملکہ امید کا باغ ہے وہ ملکہ آرزو کی بیٹی
ہے۔ ذرا سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس
چیزیں لئے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور وشور مچاتے
دیکھا یہ انہی کے اشاروں پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔
آنکھ اٹھا کر دیکھو تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالی شان
ہے اور اس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزار جوانی عین
بہار پر ہے سر تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیر لب
پارہ کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر تاج مرصّع، موتیوں کے ہار
خلعت زرنگار کشتیوں میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت
اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے اسکے دائیں بائیں دست بستہ
حاضر ہیں اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش بچھا ہے۔ عیش مدام
اور فرحت دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ
اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی
کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف

متوجہ ہے اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی مگر ہرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا، دیواریں لپی ہوئیں، دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا "قناعت کا آرام گھر"۔ بعضے تھکے ماندے ان میں چلے آتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ راستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

"نیرنگ خیال"

"نہیں"

عجیب زبان ہے۔ جن لوگوں نے مختلف زبانوں کے لغات
میں زندگی صرف کی ہے انھیں معلوم ہوگا کہ بعض الفاظ متضاد
معنی رکھتے ہیں۔ خصوص عربی لغت کی کتاب میں تو اِس قسم کے لغات
اضداد سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لفظ بھی اپنے آثار کے لحاظ سے ہمیں
اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو مشہور ہے کہ ایک "نہیں
سے سو بلائیں ٹلتی ہیں" اور دوسری طرف اہل غرض خصوصًا ہمارے
ملک کے بڑے شوق آرزومند عاشق مزاجوں کو روز ہی تجربہ ہوجایا
کرتا ہے کہ ایک نہیں سے اُن پر کیسی کیسی مایوسیاں طاری ہوجاتی ہیں
اور کتنی بڑی بڑی ناامیدیاں مبتلائے آفت کر دیتی ہیں۔ کسی کی
زبان سے "نہیں" نکلا اور وہ بیتاب ہوگئے۔ کسی نے روکھی صورت بنا کر
سر ہلا کے زبان سے "اُہوں" کہا اور انھوں نے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیا۔

غور سے دیکھئے تو دونوں جہتیں اپنے موقعے پر مزے کی ہیں۔

بے مزہ کوئی نہیں۔ پہلی جہت لیجئے جس سے سو بلائیں ٹلتی ہیں، بالکل ٹھیک، مثل مشہور ہے "کردن صد عیب و نہ کردن یک عیب" نہ کردن کیا معنی؟ یہی کہ زبان سے "نہیں" کہہ دینا۔ پھر دیکھئے کہ عیب بھی ہے تو کس مزے کا کہ سینکڑوں عیوب سے نجات مل جاتی ہے۔

اگر یہ قوم کے وہ ناسمجھ جن کی فضول خرچیوں پر ایک زمانہ رو رہا ہے "نہیں" کا سہل سا لفظ سیکھ لیں تو نہ اُن پر وہ مصیبت آئے جس نے ہزاروں گھرانے تباہ کر دیئے اور لاکھوں خاندان خاک میں ملا دیئے اور نہ ہمدردانِ قوم کو اس طرح ناامید ہو ہو کے رونا پڑے جس طرح بالفعل روز رویا کرتے ہیں اور کوئی مشکل نہیں۔ آپ ہی بتلایئے کہ اب اس سے زیادہ آسان ترکیب کون سی ہوگی؟

حیرت تو یہ ہے کہ یہی "نہیں" ہم سے زیادہ اُن لوگوں کے کام آتی ہے جن کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہیں جنہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور قوم پر کیسی تباہی آگئی ہے۔ اپنے ذوق کے موافق وہ اس لفظ سے بڑا کام نکال لے جاتے ہیں اور سچ تو یوں ہے کہ اگر ہم ان کی سوسائٹی میں جائیں تو یہ لفظ ہمیں کھل جائے اور گھبرا کے ہم یہ دعا کرنے لگیں کہ خدا کرے ہمیں یہ لفظ بھول ہی جائے معاذ اللہ۔ یہ ایک مختصر سا لفظ ہے کہ ساری لیاقتیں اور تمام زبان آوریاں، ریفارمروں کے خیالات، عقلا کی تدبیریں، واعظوں کی نصیحتیں

سب اسکے سامنے مٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اخبار ملاحظہ فرمائیے "نہیں" بدتہذیبوں کو چھوڑیئے۔ "نہیں"۔ ان خیالات سے باز آئیے۔ "نہیں"! بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی، کبوتر بازی یہ سب رذیلوں کی باتیں ہیں شریفوں کو ان سے تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ "نہیں" پڑھنا لکھنا شریف کے لئے ضروری ہے۔ "نہیں"۔ روپیہ مفت نہ لٹانا چاہیئے "نہیں" یہ خدا کی امانت ہے۔ "نہیں" ایک دن مرنا ہے۔ "نہیں"۔ خدا کو منھ دکھانا ہے۔ "نہیں" کچھ دین کی بھی فکر چاہیئے۔ "نہیں"۔ ہر بات سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ "نہیں"، معاذ اللہ! آخر ضد کی بھی کوئی حد ہے جناب ضد بری ہوتی ہے۔ "نہیں" معقول سنا آپ نے؟ دیکھئے یہ لفظ کس قدر اُن لوگوں کے کام آتا ہے۔ یہ سب "نہیں" کی پہلی ہی صورتیں ہیں غور تو اس بات پر کرنا ہے کہ یہ لفظ کس آسانی سے بلاؤں کو ٹالی دیتا ہے۔ عقلمند کی "دور بلا" ایک مشہور مقولہ ہے مگر انصاف کیجئے کہ "نہیں" ایک ایسا لفظ ہے جو عقلمند اور بیوقوف سمجھدار اور ناسمجھ ہر ایک کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔ عقلمند جس بات کو نامناسب سمجھتا ہے اسکی نسبت سوچ سمجھ کے "نہیں" کہہ دیتا ہے۔ بیوقوف جس امر میں ایک ادنیٰ ظاہری مخالفت پاتا ہے فوراً بے غور کئے "نہیں" کہہ دیتا ہے۔ سمجھدار اسی لفظ کو لوگوں سے مشورہ کے لئے کہتا ہے اور ایک ناسمجھ بچہ ضد پر آجاتا ہے تو نوجوان

امر لئے قوم کی طرح بُری اور بھلی ہر بات پر "نہیں" سمجھنے لگتا ہے۔ غرض کوئی نہیں جو اس لفظ کو استعمال میں نہ لاتا ہو۔ جو بری رائے کسی مہیب دشمن کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ اگر ٹلتی ہے تو "نہیں" سے۔ حقیقت میں "نہیں" ایک بڑا مفید اور بکار آمد منتر ہے۔

یہ تو پہلی جہت تھی اب دوسری جہت لیجئے۔ وہ قیامت ہی ڈھا دیتی ہے "نہیں" کے پہلے اور دوسرے اثر میں فرق یہ ہے کہ پہلا اثر تو کہنے والے پر پڑتا ہے۔ بلا اسی کے سر پر نازل ہوتی ہے جسے یہ ظالم لفظ سننا پڑتا ہے۔ ہائے اس کی صورتیں دیکھئے تو دل کو اتنا بڑا صدمہ پہنچے کہ کبھی بھولئے ہی نہیں۔ بھولنا کیسا ہر وقت دل پر ایک بے قراری کا اثر باقی رہے۔ ایک آوارہ گرد حرماں نصیب دشت وحشت کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ گم گشتگی کے ہاتھوں اس قدر تنگ ہو رہا ہے کہ باوجود تھک جانے کے کسی جگہ دم نہیں لیتا۔ تلووں میں کانٹے پیوست ہو گئے ہیں اور جو قدم آگے رکھتا ہے اور زیادہ پیوست ہوتے جاتے ہیں۔ مگر اتنا بھی نہیں ٹھہرتا کہ انھیں نکال کر پھینک دے زندگی سے عاجز آگیا ہے۔ امید گھڑی گھڑی پہلو میں گدگدا دیتی ہے اور جو پاؤں بالکل بیکار ہو گئے ہیں انھیں وہ جلدی جلدی اٹھا کے چلنے لگتا ہے۔ چلتے چلتے اسے بیابان میں دور سے کسی اور شخص کی صورت نظر آتی ہے۔ یہ اُسے دیکھ کے لپکا اور اُس سے۔ جو اس کی

صورت دیکھی تو وہ بھی اسکی طرف جھپٹا۔ دونوں چونکہ مردہ جوش سے کام لے کر چلے تھے دو ہی چار قدم چلے ہونگے کہ گر پڑے۔ اب پڑے پڑے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے ہیں اور دل میں افسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے آواز نہیں پہنچ سکتی۔ امید نے خدا جانے دونوں کے کانوں میں کیا کہدیا اور نہیں معلوم ہمت نے کیسی مدد کی کہ دونوں گھٹنے پکڑ پکڑ کے اور سسکیاں بھر بھر کے اٹھے اور شوق کے ساتھ ایک دوسرے کے پاس جانے کی کوشش کرنے لگے۔ شوق نے بڑی مدد کی کہ دونوں میں تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا مگر کہاں تک؟ پھر گر پڑے۔ جب اپنی اپنی تھکن پر آہ کھینچنے سے فرصت ملی تو ایک نے پوچھا۔ "آپ کو راستہ معلوم ہے؟" اس کے ساتھ ہی اُس نے بھی سوال کیا۔ "کہیں اُدھر پانی تو نہیں مل سکتا؟" پیاس کے مارے میرا دم نکلا جاتا ہے" دونوں طرف سے ایک ساتھ آواز آئی "نہیں" اور اس آواز میں خدا جانے کیا تاثیر تھی کہ سنتے ہی دونوں کو غش آگیا۔ صاحبو! اِس "نہیں" نے ان دونوں پر چاہے جو اثر کیا ہو مگر بتلائیے آپ پر کیا اثر ہوا؟

ایک ہمدرد قوم نے دم بھر کر غور کرنے کے لئے دل بیتاب کو ٹھہرایا ہی دل ہی دل میں کہہ رہا ہے کہ "افسوس اب تو امیدوں میں روز بروز ناامیدی ہی ہوتی جاتی ہے، کیا کیا جائے؟ آخر تنزل کی بھی کوئی انتہا ہے؟

باغ اسلام ویران ہوگیا۔ ہری ہری کونپلیں جو نکلی تھیں وہ بھی مرجھا گئیں، آبیاری کی کچھ فکر نہیں کی جاتی۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہائے دنیاوی وقعت اور عزت درکنار، اب تو یہ لوگ دین کو بھی روز بروز چھوڑتے جاتے ہیں، مسجدیں سنسان پڑی ہیں کوئی خبر گیراں نہیں۔ قومی مسافر اور غریب الوطن مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا۔ اتقا کا نام نہیں۔ زہد میں ریا ملا ہوا ہے، عبادت دکھانے کو کی جاتی ہے۔ فقیری جوگ ہو گئی۔ امراء کو کچھ فکر نہیں۔ علماء کو خیال نہیں کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ مقتدایان دین باہم لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ عوام ان بھیڑوں کی طرح جنکا کوئی نگہبان نہ ہو، ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں اور اس سب پر مصیبت یہ کہ افلاس کو اس جگہ سے انس سا ہوگیا ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو۔ یہ سوچتے سوچتے وہ آب دیدہ ہوگیا۔ پھر آپ ہی خیال کیا کہ فلاں شخص اس وقت بڑا صاحب مقدور ہے اگر وہ قومی خدمت پر آمادہ ہوجائے تو بہت کچھ کام نکل سکتا ہے۔ کسی نہ کسی قدر اصلاح ضرور ہو۔ ممکن ہے کہ اپنے سرمایہ ہی سے کوئی کام کرلے۔ اور وہ ایک مؤثر شخص بھی ہے اگر اسکی زبان سے کسی کام کی تحریک کرائی جائے تو اور بہت سے امرا بھی متوجہ ہوجائیں گے۔ فقط یہی نہیں عوام بھی اس بات کو دل سے سنیں گے جو اس کی زبان سے کہلائی جائے گی۔ یہ کہہ کے

بشاش چہرے سے اٹھا اور ذی مقدور رئیس قوم کے پاس گیا۔ وہاں جا کے اپنی غرض نہایت پر درد الفاظ میں بیان کی۔ جہاں تک زبان نے یاری دی، قومی ادبار کی تصویر کھینچ کے دکھا دی اور اُس رئیس کا دِل نرم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جواب ملا "اجی میرے کئے سے کیا ہوگا؟" جو دوسرے الفاظ میں کہا جاتا تو "نہیں" ہوتا۔ یہ "نہیں" کا مترادف جواب سن کے اسکے دل پر چوٹ لگی۔ اور ایک بار کوشش کی کہ اپنی نا امیدی کو رفع کرلے۔ اُسی غرض کو مکرر ملتجیانہ انداز میں کہا۔ مگر پھر بھی وہی بلکہ اُس سے زیادہ سخت جواب ملا۔ روتا ہوا اٹھا کہ کسی عالِم کے پاس جائے اور اپنی غرض اُن سے کہے۔ عالِم صاحب فضیلت مآبی کی وجہ سے اپنے تئیں پختہ مغز سمجھتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سنگ دلی کا مادہ اُن میں زیادہ تھا۔ ان کے زعم میں کسی اور کی رائے پر عمل کرنا ان کے مرتبے سے بہت ادنٰی بات تھی۔ اس دردمند ہمدرد قوم کے حسرت بھرے جملوں کو غور سے سنا بھی نہیں اور صاف کہدیا "نہیں مجھ سے نہیں ہوسکتا۔" یہاں یہ شخص بالکل نا امید ہوگیا اور واپسی کے وقت دِل میں کہتا جاتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچی پیشین گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ فتنوں کا ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ میں سب سے اچھا وہی شخص ہوگا جو دنیا کو چھوڑ دے اور شعب الجبال یعنی پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بھیڑ بکریوں کا ایک گلہ لیکے بیٹھ رہے اور انھیں پر

زندگی بسر کرے گویا اُس مقام پر سکونت پذیر ہو جہاں تک نہ فتنہ ہائے دنیا کا اثر پہونچتا ہو اور نہ دنیا کے لوگ پہنچ سکتے ہوں نہ سوائے خدائے لایزال کے کسی کی حکومت ہو اور نہ کسی کی حفاظت ہو۔ بے شک اب وہی زمانہ ہے جب دنیا سے مایوسی ہو گئی اور قوم روز بروز اپنی طرف سے آپ نا امید کر جاتی ہے تو مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھیے صرف "نہیں" کا لفظ تھا جس نے اس جان نثار قوم کا دل دُنیا سے کھٹا کر دیا۔ اب اس سے زیادہ کیا نا امیدی ہو گی کہ یہ شخص دنیا کے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گیا۔

ایک نامراد عاشق جس نے اپنی زندگی میں تمنائے یار کا بہت کچھ لطف اٹھایا ہے اور جسکی عمر گویا وصال جاناں کی آرزو میں گذری ہے۔ خیالی امیدیں باندھتے باندھتے زندگی سے تنگ آگیا۔ اب روز بروز اسکے دل پر نا امیدی غالب آجاتی ہے کہ وہ کبھی اپنے خیالات اور اپنی دھن میں کامیاب ہو گا۔ اسے یقین ہو گیا کہ معشوق باوفا نہیں بے وفا ہے۔ مگر امید نے یک بہ یک دل میں ایک جوش کے ساتھ ترقی کی اور ترقی کرتے کرتے اس حد کو پہنچی کہ سب نامرادیاں بھول گئیں اور یہ آرزومند امید کی رسی میں بندھا کھنچتا ہوا درِ جاناں پر پہنچا۔ کوئے جاناں کی ہوا کھائی۔ وہاں کے سین کو کچھ ایسا مانوس پایا کہ

در و دیوار، زمین و آسمان جو جو چیز سامنے آگئی اُسے محبت کی نظر سے دیکھا۔ جیسے اُسکے خیال میں یہ عزت حاصل تھی کہ کبھی کبھی معشوق کی پیاری آواز اُس میں گونجتی ہے۔ اور دل میں بڑی پرجوش محبت کے ساتھ کہا کہ ہائے یہی فضا میرے لئے وہ آلۂ ٹیلیفون ہے جسکے ذریعہ سے میں اپنی ماہ وش معشوقہ کی باتیں سُن سکتا ہوں۔ اس خیال نے اور ترقی کی کہ ایک عجیب امیدوارانہ سکوت کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ شاید کسی طرف سے اُس مہ جبین کی آواز آجائے۔ اتنے میں اوپر ایک کھڑکی کُھلی۔ جسکے کھلنے کی آواز نے اُس سراپا امید پر حسن کے نقیب کی آواز کا اثر کیا اور اُس نے نہایت ادب سے اوپر نگاہ اٹھائی رشوق کے ولولے کب رکنے دیتے تھے۔ آنکھ لڑاتا تھا کہ اس بیتاب کی مدت کی ترسی ہوئی نگاہیں شوخیاں کرنے لگیں۔ نہایت ہی پر شوق لہجے میں ہمارے دلدادہ یار نے کہا۔ "آخر کبھی آرزو بھی پوری ہو گی؟"۔ جواب ملا۔ "نہیں"۔ دل پر ایک چوٹ لگی مگر ضبط کر کے پوچھا۔ "پھر کیا ہم پر کسی کو ترس نہ آئے گا؟" اب بھی وہی جواب سنا گیا۔ "نہیں" پھر صبر کیا اور کہا۔ "ان تمناؤں کے بر آنے کی کوئی صورت بھی ہے؟" آواز آئی۔ "نہیں" ابھی انتہا سے زیادہ ضبط کرنا پڑا۔ کیونکہ بیتاب عاشق نے کلیجے پر ہاتھ رکھ کے سوال کیا۔ آخر ہمارے مرض کا کوئی علاج بھی ہے؟" ایک بے رخی کے ساتھ پھر کہدیا گیا "نہیں" مشتاق نے اس پچھلی نہیں کے ساتھ ہی کہا

"کیا تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کوئی مر جائے گا؟" مسکرا کر جواب دیا
"نہیں" اُس ماہوش کے مسکراتے وقت خدا جانے کس قیامت کی
بجلی گری تھی کہ ادھر پیاری زبان سے "نہیں" نکلی اور ادھر یہ آرزومند
دھم سے زمین پر گرا۔ دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ مگر عاشق کے دائمی سکوت نے
خدا جانے کیا اثر کیا تھا کہ اُس ملائک فریب نازنین کو اپنے دل پر
اختیار نہ رہا۔ یکایک نازک دل میں ایک ایسا جنون انگیز جوش پیدا
ہوا کہ نہ پاس ناموس تھا اور نہ خیال رسوائی۔ اُدھر عاشق زمین پر گرا
اور ادھر وہ نازک بدن کھڑکی سے کود دی۔ ناز و انداز ایک طرف
رکھ دیئے گئے۔ غرورِ حسن بالائے طاق رہا۔ عاشق جاں دادہ کی لاش سے
لپٹ کر کہا۔ نہیں میں غلط کہتی تھی۔ مجھے تمھارے جان دے دینے کا
یقین تھا۔ لاش نے زبان حال سے کہا۔ "نہیں" بیتاب ہو کے کہا
"ہائے اب اٹھ بیٹھو۔ پھر کبھی نہیں نہ کہونگی۔" سکوت کے لہجے میں جواب
ملا۔ "نہیں" مایوس ہو کے پوچھا "تو کیا اب نہ اٹھوگے؟" پھر وہی جواب
ملا "نہیں" اس پچھلی "نہیں" نے اُس حور وش نازنین پر بھی ایک
دائمی خموشی طاری کر دی اور بڑی حسرت کے ساتھ اپنے شیدا کی
لاش پر گر کر ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

حضرات! اب فرمائیے کہ اس "نہیں" نے کیسا اثر کیا؟ اور آپ کی
کیا حالت ہے؟ دل میں ضبط کی تاب نہ رہی ہوگی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ

آپ میں جواب کی طاقت نہیں۔ علاوہ بریں ڈرتے ہیں کہ کہیں آپ بھی "نہیں" نہ کہدیں۔ ہمیں اس جواب سے بہت خوف معلوم ہوتا ہے۔ خدا کے لئے اگر یہی کہنا ہو تو زبان روکے رہیئے گا۔

ہائے! نہیں! تو بڑا سخت لفظ ہے! بس اب ہماری یہی دعا ہے کہ "بارالٰہا چاہے جو کچھ ہو مگر ہم یہ ظالم لفظ نہ سنیں"۔

مضامین شرر

"ھم"

کسی نے کسی سے پوچھا۔ "قیامت کس دن آئے گی؟" جواب دیا "قیامت صغریٰ تو اس دن ہوگی جس دن تم مروگے اور قیامت کبریٰ اُس دن ہوگی جب ہم مرینگے"۔ بھلا اس میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟ نہیں، دنیا میں جو کچھ ہیں ہم ہی تم ہیں بس اور کوئی نہیں۔ اس صفحۂ ہستی پر حکومت کرنے اور اسکی دلچسپیوں سے لطف اٹھانے کے لئے

ہم اگر بادشاہ ہیں تو تم وزیر ہو۔ ہم اگر آفتاب ہیں تو تم ماہتاب ہو۔ اور تمھارا نام بھی صرف مروّت یا خاطر سے لے دیا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے سوا کوئی نہیں۔ تم ہو بھی تو فقط اس لئے کہ ہمارا دل بہلاؤ۔ ہماری خاطر داشت کرو۔ ہماری ہمدردی کو آمادہ ہو اور ہمارا ادب کرو۔ اور اگر تم میں یہ وصف نہیں اور اپنی ان رعیتوں کے سے حقوق تم نہیں بجا لاتے تو تم بھی کچھ نہیں بس ہم ہی ہم ہیں۔

صاحبو! ہمارے اس دعوٰی "انا ولا غیری" کو سُنکر ہنسو نہیں۔ ہمیں مجنوں نہ خیال کرو۔ غور کرو گے اور انصاف سے دیکھو گے تو خود ہی سمجھ جاؤ گے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ ہے اور ہمارے اس دعوے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سامنے تمھاری کوئی ہستی نہیں آخر تم ہی کہو کہ یہ دنیا میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے سوائے ہمارے کسی اور کے لئے ہے؟ فطرت کے جذبات ہمارے سینے میں جوش بیخودی پیدا کرنے اور نیچر کے لطف ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ کے مسرور کر دینے کے لئے نہیں تو پھر کس لئے پیدا کئے گئے ہیں؟

اگر صحراؤں نے اپنی سطح پر سبزے کا فرش زمردیں بچھا کے اُسے جنگلی خودرو پھولوں سے سجا ہے تو اس لئے کہ ہم سیر کرنے کو آئینگے اگر باغوں میں مشاطۂ بہار نے نوعروسان چمن کو پھولوں کا زیور پہنایا ہے تو محض اس غرض سے کہ ہم دو گھڑی کو اُدھر ٹہلتے ہوئے

نکل آئیں اور ان کیفیتوں کو دیکھ کے خوش ہوں۔ جانفزا وادیوں میں اگر نہریں لہراتی اور کسی معشوقہ بادہ نوش کی طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی بہتی ہیں تو اس لئے کہ ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے مرکز و منشا کی جگہ پر اگر سر بفلک پہاڑوں نے برف کے سفید کپڑے پہن لئے ہیں تو اس سبب سے کہ یہ لباس ہمیں بہت ہی پر لطف نظر آتا ہے۔ کسی دلربا نازنین نے اگر بناؤ سنگار کیا ہے تو اس لئے کہ ہم اُسے بگاڑ دیں اور کسی کے حسن و جمال میں اگر خدا نے دلفریبی و دلربائی کی شان پیدا کی ہے تو اسلئے کہ ہم اُس سے لطف اٹھائیں۔

ہم جہاں تک غور کرتے ہیں یہی نظر آتا ہے کہ عالم کی یہ ساری خوبیاں اور دلچسپیاں صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ ہماری ذات سے ہیں ہم نہ ہوں تو دنیا میں کچھ نہیں۔ عشق کی رونق ہم سے ہے اور بازار حسن کی چہل پہل ہیں ہماری ہی بیتابیوں اور زندہ دلیوں کی گرمی ہے۔ یہ باتیں بھی خیر خیالات اور جذبات کی حد تک محدود ہیں۔ اگر واقعات اور موجودات کا مقابلہ کرو تو بھی ہم ہر ایک سے بڑھے ہوئے رہینگے۔ ہماری ہی صورت اس قابل ہے کہ حسین سے حسین نازنین اس کی قدر کریں ہماری ہی سیرت میں یہ کمالات ہیں کہ بڑا سے بڑا عالم دانا اگر ہمارا معتقد و معترف نہ ہو تو وہ عالم نہیں جاہل ہے۔ حُسن کا قدردان اگر ہماری

صورت زیبا کی قدر نہ کرے تو سمجھ لو کہ خدا نے اُسے ذوق صحیح نہیں دیا۔ وہ معشوقۂ ناز آفریں جسے اپنے حُسن و جمال پر انتہا سے زیادہ ناز ہے اگر ہمارے عشق اور ہماری محبت کی قدر نہ کرے تو جانو اُسکا سر پھر گیا ہے۔

اور کیونکر نہ ہو؟ عالم میں جو کچھ ہے ہمارے ہی لئے ہے۔ خدا نے اپنی قدرت کی جو یہ مزہ دار نمائش گاہ مرتب کر رکھی ہے اس سے لُطف اٹھانے والے فقط ایک اکیلے ہم ہی ہیں۔ آسمان کا یہ نیلگوں رنگ جس سے گلبدنان عالم اپنے دوپٹوں کے لئے ایک نظر فریب رنگ کا سبق لیا کرتے ہیں ہمارا ہی دل بہلانے کے لئے ہے۔ آسمان پر یہ آفتاب ماہتاب ہماری ہی صحبت و عیش کا چراغ روشن کرنے کے لئے ہیں۔ اور یہ دلفریب تارے محض اس غرض سے ہیں کہ انکی نورانی اجرام پر نظر جما جما کے ہم کسی دلربا کی یاد تازہ کر لیا کریں۔ نسیم سحر کے جھونکے اس لئے آتے ہیں کہ ہمیں فرحت بخشیں اور ابھی چند روز ہوئے جو لو کے جھونکے چل رہے تھے وہ بھی اس مقصد سے تھے کہ ہم میں ٹھنڈی اور زندگی بخش ہوا کی قدر کرنے کا مادہ پیدا ہو۔ مینہ اسی لئے برستا ہے کہ ہماری صحبت بادہ نوشی میں زندہ دلی پیدا ہو اور بجلی اسی غرض سے چمکتی ہے کہ ہم کسی کے گھبرا گھبرا کے سہم جانے کا تماشہ دیکھیں۔

ہم جو کہتے ہیں کہ عالم کی ساری دلچسپیاں اور خدا کی پیدا کی ہوئی

نعمتیں ہمارے ہی لئے ہیں۔ اس میں شاید تمھیں شک ہوگا۔ ہماری یہ انانیت اور خود پرستی کے دعوے سُن سُن کے تم ہنس رہے ہو۔ تمھاری صورت کہے دیتی ہے کہ ہمیں بیوقوف یا مجنون خیال کرتے ہو۔ اچھا تو ہم تمھیں ایک ثبوت بھی دے دیتے ہیں۔ دیکھو جب تک ہم جوان تھے۔ دنیاوی مسرتوں سے لطف اٹھانے کے قابل تھے۔ اس وقت تک ان سب کیفیتوں میں دلچسپی بھی زیادہ تھی اور جب ہماری طبیعت بجھنے لگی۔ بڑھاپے نے ہمارے حوصلے پست کرنے شروع کر دیئے اُس وقت سے ان چیزوں میں مزہ بھی نہ رہا جو پہلے تھا۔ پھر اگر یہ سب لطف اور یہ تمام نعمتیں ہمارے لئے نہ تھیں تو ہماری طبیعت کے سست ہوتے ہی بے مزہ کیوں ہو گئیں؟ اس زمانے کے میلوں اور اس دور کی صحبتوں کو نوخیز اور نوعمر لڑکے چاہے کتنا ہی دلچسپ بتائیں مگر ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ان میں نہ وہ اگلی سی رونق ہے نہ وہ پرانی دلچسپیاں ہیں۔ نہ وہ چہل پہل ہے اور نہ وہ زندہ دلی باقی ہے۔ ہماری عمر کے پرانے زمانے والے جو باقی ہیں تم ان سے چاہے جا کے دریافت کر لو کہ کبھی زمانے میں یہ صحبتیں کیسی با مزہ اور پر لطف تھیں اور جب سے ہم بوڑھے ہوئے کیسی سست اور افسردہ ہو گئیں۔

ہمارے حالات اور ہمارا تخلیق عالم کی اصلی غرض سمجھ جانے کے بعد اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہیں ہم ہی ہم ہیں۔

تم دنیا کی ہر چیز کو غور و فکر سے دیکھو صاف سمجھ جاؤ گے کہ جو چیز ہم سے جس قدر قریب ہے اور ہم سے جتنا زیادہ علاقہ رکھتی ہے اُسی قدر اچھی ہے اور اُس سے جس قدر ہم سے بُعد ہوتا گیا ہے اُسی قدر ادنیٰ اور بیکار ہے یوں تو دنیا میں ہزار ہا ملک پڑے ہیں جن کی خدا جانے کیسی کیسی تعریفیں سُنی ہیں مگر تمھیں بتاؤ بھلا اس شہر میں جس میں ہم رہتے ہیں۔ جسکو ہمارا وطن ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس میں بھی خاصتہً اس محلے سے جس میں ہمارا مکان ہے کُرہ زمین پر اور بھی کوئی اچھی اور دلچسپ جگہ ہے! ہر جگہ اور ہر قوم میں طرح طرح کے آئین و قوانین جاری ہیں اور نئی رسموں پر عمل کیا جاتا ہے مگر قبل اسکے کہ ہم اُن قوانین و رسوم کو دیکھیں اور اُن کی نسبت کوئی رائے قائم کرنے کا موقع پائیں تم سے کہے دیتے ہیں کہ نہ وہ قوانین ہمارے قوانین سے اچھے ہیں اور نہ وہ رسمیں ہماری رسموں سے اچھی ہو سکتی ہیں۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ دنیا میں ایک سے بڑا اور زبردست مذہب پڑا ہوا ہے۔ اور جس میں دیکھو خداشناس بانیان مذہب الٰہیات کے رموز بتا رہے ہیں مگر ہمارے مذہب کے سامنے کسی کی کوئی وقعت نہیں۔ بس ایک ہمارا مذہب سچا ہے اور سب جھوٹے۔ اب تم اسے چاہو جنون کہو یا کفر ہمیں تو نظر آتا ہے کہ خدا بھی وہی اچھا ہے جو ہمارا خدا ہے اور خالق بھی وہی بڑھا چڑھا ہے جو ہمارا خالق ہے۔

خداوند جل وعلا چونکہ بے چون وچگون اور مجرّد محض ہے اور اُس کی کُنہِ ذات کو کوئی مادی شخص سمجھ ہی نہیں سکتا لہذا ہر مذہب کو عبادت کے لئے کسی سمت یا تشخص کے ڈھونڈھنے کی ضرورت پڑی۔ ہر بانی مذہب نے اسی سمت عبادت کے انتخاب میں ایک خاص قسم کا کمال دکھایا ہے۔ ہندوؤں نے قوی ہیکل اور بڑے بڑے یا معمول سے زیادہ ہاتھ پاؤں والے دیوتاؤں کو مرکز و مرجع عبادت قرار دیا۔ یونانیوں نے خوبصورت اور صاحب جمال عورتوں کی صورت کو مظہر قدرت مانا۔ آتش پرستوں نے نورونار کو عبادت الٰہی کا واسطہ قرار دیا۔ یہود ہیکل سلیمانی کو اپنے عقائد خداپرستی کا مرجع و ماوای خیال کرتے تھے۔ مسیحیوں نے اپنے خیالات کو صلیب اور مسیح مصلوب کی تصویر سے وابستہ کیا۔ مسلمان جو شرک کے کانٹوں سے اپنا دامن بچا رہے تھے وہ بھی آخر مجبور ہوئے اور کعبے کے سامنے سر جھکا کے کھڑے ہوگئے۔ یہ سب انتخابات ہوئے مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کسی نے اپنی عبادت کے لئے ہمیں سمتِ عبادت کیوں نہ قرار دیا؟ اور اپنا سر ہمارے سامنے کیوں نہ جھکایا؟ آخر ہم سے بڑھ کے مظہر قدرت اور کون ہے؟

خیر اگر کوئی نہیں تو ہم خود اپنی عبادت کیوں نہ کریں؟ یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہمارا دل خدا کا عرش ہے اور خارجی تعریفیں بھی تم سن چکے پھر ہم سے زیادہ خدا کی قدرت کا مکمل نمونہ کون ہوسکتا ہے؟

اور یہ جو ہم اپنی پرستش نہیں کر رہے ہیں یہ بھی ظاہر ہیں اور دکھلانے کے لئے ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی ہر چیز کو جس قدر عزیز رکھتے ہیں، اپنی جس قدر قدر کرتے ہیں اور جس عنوان سے اپنے مقابلے میں کسی کی ہستی نہیں سمجھتے یہ پرستش ہی کے درجے کو پہونچا ہوا ہے۔

پھر ان ہی حالات کو دیکھ کے اور اپنے ان کمالات پر نظر ڈال کے اگر صوفیوں نے جوش و خروش کے ساتھ "انا الحق" کا نعرہ بلند کر دیا تو کیا برا کیا۔ یا بایزید بسطامی کی زبان سے کلمۂ "لیس فی جبّتی سوی اللّٰہ" نکل گیا تو کیا بری بات ہوگی؟

مضامین شرر

"آل کچہری"

یہ آل بھی کچہری سے دامن بچائے کھڑا ہے۔ اسکو بھی کچہری سے ڈر ہے یا چھوت لگ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ آل عربی نژاد ہے ہندی کچہری سے احتیاط اسکا قومی فرض ہے مگر کیا کرے۔ اشارہ کرنے کو جس طرح انگریزی میں "دی" کی ضرورت پڑتی ہے۔ مسلمان آل کو حرف اشارہ سمجھ کر کام میں لاتے ہیں۔

آل کہتا ہے وہ کچہری ہے۔ اس اشارہ میں بڑی بلاغت ہے، بڑی ظرافت ہے کیونکہ کچہری کو ہم لوگوں نے جھوٹ بولنے کا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ بڑے بڑے ثقہ لوگ جن کی ساری عمر سچ بولتے ہیں صرف ہوتی ہے کچہری میں جاکر جھوٹی گواہی دے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچہری میں سچ کیونکر بولیں۔ یہ آل اسکا اشارہ کرتا ہے یعنی وہی کچہری جس میں جبہ و عمامہ کو جھوٹ جائز ہے۔

جغرافیہ ہر کچہری کا سارے ملک میں ایک ہی۔ کچہری ایک جزیرہ ہے جسکے آس پاس عقل و تدبیر کے پہاڑ ہیں اور پھر قانون کے سمندر۔

کچہری میں قانون انصاف کے تخم بوتا ہے مگر اہل مقدمہ اپنی چالاکیوں کا کھاری پانی دیکر اس بیج کو ہرا نہیں ہونے دیتے۔ اسلامی حکومت کے زمانہ میں بھی کچہری کا یہی حال تھا اور مجھ جیسے دیوانے لوگ قاضیوں کے چٹکیاں لیا کرتے تھے۔

"کچہری کے جراثیم"

ڈاکٹر نے ہر جسم میں کیڑے دریافت کئے ہیں۔ وہ ہر مرض کا سبب جراثیم یعنی کیڑوں کو بتاتے ہیں اور کچہری بھی ہستی ہے، ایک وجود ہے، ایک جسم ہے۔ اسکے بھی جراثیم ہیں اور وہ وکیل، بیرسٹر اور مختار ہیں۔ کچہری کا مرض ان کیڑوں سے پیدا ہوتا ہے۔

جس نے کچہری کی شکل نہ دیکھی ہو وہ کسی وکیل یا بیرسٹر سے ملاقات پیدا کرے۔ ایک دفعہ کا ملنا اسکو کچہری کا شائق بنا دے گا کیونکہ اس میں کچہری کے کیڑے گھس جائینگے۔

ان کیڑوں کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ یہ کیڑے ملک کے اچھے نچھے آدمیوں کو بیمار کر دیتے ہیں۔ کچہری کا مریض اور عشق کا بیمار ایک ہی حالت رکھتا ہے۔ عاشقی کا مرض بھی آدمی کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور کچہری کی بیماری بھی انسان کا کام تمام کر دیتی ہے۔ کچہری کا چلنے والا رسیلی اور حسین آنکھ سے بیزار ہوتا ہے اسکو کسی معشوق کے قد زیبا اور سخن شیریں کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ

دفعات قانون کے ہندسوں پر مرتا ہے۔ تعزیرات ہند کی کتاب اسکے لئے نامۂ محبوب ہے اسی کو سینہ سے لگاتا ہے۔ اسی کو چوم چوم کر جی ٹھنڈا کرتا ہے۔

کچہری کا دلدادہ مسٹر ایل۔ایل۔بی کی گلی میں سو سو پھیرے کرنے میں ایک لذت پاتا ہے۔ اسکی جان میں جان آجاتی ہے جب وکیل یا بیرسٹر صاحب کی زبان سے مقدمہ کی سرسبزی کا کوئی جملہ سُن لیتا ہے۔ کچہری کا بیمار مرتے وقت صرف ایک ہی آرزو کر سکتا ہے کہ اُسے کبھی قانون پیشہ آدمی کا چہرہ دکھا دو یا کم سے کم اسکے گھر کا سائن بورڈ (نام کا تختہ) ہی منگا دو۔

کچہری کے مبتلا کو جب موت آتی ہے اور اسکے آس پاس کلمہ پڑھا جاتا ہے تو اسکے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

کوئی صفدر بیگ حاضر ہے!!!

اور وہ فوراً حاضر حاضر کہتا ہے اور گھبرا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں فرشتے اسکے سامنے آئے ہیں اور خدا کی حضوری کا پیام لائے ہیں۔ کیسا نیک اور جنتی ہے کہ منھ سے حاضر حاضر نکلتا ہے۔

کچہری کا دیوانہ اخبارات میں کسی خبر اور مضمون کو نہیں پڑھتا اسکی نظر مقدمات کے اشتہاروں پر ہوتی ہے اور جب کبھی اخبار میں اپنے مطلب کی خبر نہیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ اخبار بالکل نکما ہے اور

کام کی بات تو اس میں ایک بھی نہیں۔

کچہری کے شوقین جواریوں، شرابیوں اور تماش بینوں سے زیادہ اپنے شوق کے پکے ہیں۔ وہ مقدمہ بازی کسی حق کی خاطر نہیں کرتے۔ انکو تو جوئے اور شراب کی طرح کچہری کی ایک لت ہوتی ہے جس میں انکی دولت و زندگانی خرچ ہوا کرتی ہے۔ کچہری اور مقدمہ بازی جسکی زندگی ہے وہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک ہے اور سب سے زیادہ قابل رحم۔ کتاب مقدس تعزیرات ہند اور اس کے تمام دفعات مبارکہ کی قسم کچہری بازوں نے حکام کچہری کو بدنام کر رکھا ہے۔ کچہری کے عشاق اپنے توڑ جوڑ سے قانون کو سیدھا راستہ نہیں چلنے دیتے۔

ضرورت ہے ڈاکٹروں کی جو آل کچہری کو محکمہ حفظان صحت کے اصول کے ماتحت لا کر کچہری پرستوں کے ٹیکہ لگوائیں اور وبائے کچہری سے انکی تندرستی کو بچائیں نیز شہروں کی میونسپل کمیٹیاں جس طرح اور اور طریقے اختیار کر کے آبادی کی صحت کو امداد دیتی ہیں اسی طرح مختاروں، وکیلوں بیرسٹروں کو بھی قواعدِ صفائی میں شریک کر کے ان کو شہر سے الگ آباد کریں تاکہ یہ جراثیم عام باشندوں کو کچہری کے مرض میں مبتلا نہ کر سکیں جس سے ملک تباہ ہوا جاتا ہے۔

چٹکیاں اور گدگدیاں

"جھینگر کا جنازہ"

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اسکی لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں ہیں انکو چار چاند لگا کر چمکاؤنگا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اُچھلکر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ! بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں لہذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی

کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اسکی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کرسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں، سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سنکر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ واہ خفا ہوگئے، بگڑ گئے۔ لاجواب ہوکر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا۔ آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اسکو دیوار پر کھینچے لئے جاتی تھیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطیبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا۔ جمعے تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے نماز پھر پڑھ لینا

اس جھینگر کے جنازہ کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بیچارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریئے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا نہ سانپ کا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی نہ بلبل کی مانند پھولوں کی عشق بازی، شام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے لئے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ میری مٹی کی نشانی ایک یہی بیچارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔ چیونٹیاں تو اسکو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دینگی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا اور ویسٹ مسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں ہیں افریقہ کے مردم خورہ سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہکر مرحوم سے رخصت ہونا چاہیئے۔

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمہ ربانی گانے والے قوال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھینگے۔

چٹکیاں اور گدگدیاں

قانونِ زندگی

انسانوں کی گرفت، بازپرس، پرسش، رسوائی، ڈر، خوف، ہراس، دہشت، گھبراہٹ، اضطراب، بے چینی، خطرہ، اندیشہ دھمکی، سزائے ڈانٹ ڈپٹ، تخویف، مارپیٹ، قید، بندش، نگرانی اور تعطل کے کاغذی ذریعہ کو اگر "قانون" کہا جائے یا کہتے ہیں یا کہلا ہے یا کہنا چاہیئے یا کہا گیا ہے یا کہینگے یا کہا جائے گا یا کہو تو پھر رشوہ، نوٹس، سمن، وارنٹ، گالی، گلوج، دھول دھپیا گھونسہ، بید، لاٹھی، ہوائی فیر، گرفتاری، ہتھکڑی، بیڑی، جامہ تلاشی، حوالات، ریتلی روٹی۔ پھیکا ساگ، بغیر روشنی کا کمرہ مع مچھر، بچھو، سانپ، چالان، پیشی پر پیشی، اثبات دعوٰی۔ جواب دعوٰی۔ وکالتاً یا اصالتاً، پیروی، جواب دہی، تحریری بیان جواب دینے سے انکار، ضمانت، فرد جرم، عینی گواہ، صرفہ خوراک اقرار صالح، جرح، تنقیحات، فیصلہ، ایک درجن بید، جرمانہ، بصورت عدم ادائے جرمانہ، قید محض، قید بامشقت، کال کوٹھری،

بحالت بیڑی، کھدّر کی قمیص، بحالت قیام جیل، تختی نمبر فلاں درگلو
چکی چلانا اس حالت میں کہ قیدی کا تخلص حسرت موہانی ہو، حبس
دوام بہ عبور دریائے شور اس شرط پر کہ مجرم علاقۂ بنگال کا فرد ہو۔
قصاص، پھانسی اور سولی جب تک کہ مر نہ جائے یہ سب لوازم قانون
یا اثرات قانون کہلائینگے یا کہے جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم سے کوئی "قانون" کی تعریف دریافت کرے تو ہم
بریلی کے میلاد خواں لوگوں کی طرح بجائے کسی لغت اور بلاغت
کے قانون کو اس عملی مثال سے سمجھا دینگے کہ گھوڑے کی وہ لگام
جسکے ذریعہ گھوڑے یا گھوڑے پر بیٹھنے والے کو راستہ پر ایسا سیدھا
چلا یا جائے جو خطرے اور تصادم سے محفوظ رہے۔ اور گھوڑے کی
دوڑ یا چال یا رفتار کسی کے لئے مفید نہ ہو تو مضر بھی نہ ہو۔ اب اگر
یہ کہیں کہ قانون ان افلاطونی اصول کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کے
ذریعے کبھی کبھی مجرم بھی بلا اخذ جواب رہا ہوکر مدعی کے حق میں
الٹا ازالۂ حیثیت عرفی بن جاتا ہے تو ہم کہینگے کہ پھر افلاطون
بھی ذرا بے وقوف تھا کیونکہ قانون کی صحیح تعریف تو یہ ہو سکتی ہے کہ

"ایسا طریقہ جس سے انسان آزاد رہ کر بھی نقصان
نہ پہنچا سکے اور نہ نقصان پائے"۔

اب اس تعریف پر اگر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف لفظ "ہر گاہ" کا۔ کیونکہ اصطلاحاً ہر وہ فقرہ اور ہر وہ عبارت قانون سمجھی جائے گی یا قانون کا اثر پیدا کر کے چھوڑیگی جسکے سر پر یا شروع میں لفظ "ہر گاہ" ہو اور بقیہ عبارت اس قدر پیچیدہ اور گنجان ہو کہ اپنے بڑے مولوی صاحب بھی اسکا مفہوم نہ سمجھ سکیں۔

وکیلوں کے خیال میں "قانون" وہ ہے جس سے موکل یا موکلہ تابع ہو یا بغیر پیشی نصف محنتانہ ادا کر دے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے یا ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا رکھتی ہو یا بصورت جیت جانے مقدمہ کے دس روپیہ علاوہ محنتانہ کے "مٹھائی" کے نام سے ان کے بچوں کے ہاتھ پر رکھ دے یا انکے منشی کو دیدے۔

ان تعریفات کے بعد ہمارے نزدیک قانون کہتے ہیں اس قوت کو جو انسان کے اندر دوسرے قوٰی کی طرح موجود ہے اور جو اس کی جملہ قوتوں پر احتساب و نگرانی کرتی ہے۔ یہ قوت انسانی کو غلط کاری اور غلط روی پیدا کر کے ہر مضرت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس قوت کی بقا منحصر ہے انسان کی اچھی صحت اور بہترین ماحول پر۔ اگر انسان کی صحت نہایت درجہ معتدل اور صحیح ہو لیکن وہ جرائم پیشہ طبقہ میں رہے یا رکھا جائے تو اسکی قانونی قوت بیکار یا مضمحل ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسے ماحول میں رہتا ہے یا رہتی ہے جہاں سب یا

اکثر لوگ "قانونی زندگی" کے خوگر ہیں تو وہ ہر قسم کی غلط کاری اور غلط روی سے محفوظ رہ کر صحیح معنی کا انسان بن سکتا ہے۔ قانونی زندگی والے کی پہچان یہ ہے کہ سوسائٹی یا قوم کی متفقہ یا مروجہ طرز زندگی سے ایک بالشت، ایک انچ، ایک ہاتھ، ایک گز، ایک سوت یا ایک کلومیٹر بھی پیچھے نہ رہے اور نہ آگے بڑھے اور اسی لئے یہ واضعین قانون انسانی نے جو اصول و ضوابط انسانی زندگی کو منتظم اور محفوظ رکھنے کے لئے وضع کئے ہیں وہ سراسر انسان کو وحشت اور درندگی سے پاک کر کے پرامن اور سلیقہ مند، منتظم اور نفع بخش بنانے والے ہیں یہاں آپ واضعین قانون سے کہیں مسٹر وی، جے، پٹیل اور سر ملک عمر حیات خاں ٹوانہ کو نہ سمجھ لیجئے بلکہ وہ مافوق الفطرت انسان مراد ہیں جنھوں نے انسان کے پُرامن رہنے سہنے کے طریقے وضع کئے ہیں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ قوت آج ہمارے ملک کے افراد میں کہاں تک باقی ہے اور جو نہیں ہے تو کیوں؟ مگر اسکے پہلے ان افراد انسانی کی قانونی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ہوگی جو صحیح معنوں میں یا بڑی حد تک قانونی زندگی کے دائرے میں آتے ہیں اسلئے لامحالہ ہم کو یہی سامنے والے لوگ عرف انگریزوں کی زندگی کو مثال بنانا پڑے گا مثلاً آپ ایک انگریز کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ صبح اذان کے وقت

نیند سے بیدار ہو گا اور ہو کر رہے گا۔ پھر وہ صبح کی میونسپل کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر غسل کریگا یا منہ ہاتھ دھوئے گا یا کلی کرے گا یا ناک میں پانی نہ ڈالے گا تو سر کے بالوں کو سنواریگا یا مسواک نہ کریگا تو برش سے دانت صاف کریگا اور صاف کرکے رہیگا ورنہ چائے سے تو کسی حال میں نہ چوکے گا۔ پھر وہ اخبار پڑھے گا یا خطوط لکھے گا۔ پھر وہ اسکول جائے گا یا دفتر یا دکان یا کھیت پر یا پریڈ پر یا روٹی کے کارخانے میں یا اسٹیشن پر یا جہاز پر یا کسی کارخانے میں کام سیکھے گا۔ بہر حال وہ کہیں جاکر رہے گا۔ پھر وہ عین دوپہر سے ذرا ہٹ کر کھانا کھائے گا۔ چاہے اس وقت اسکے سامنے کسی ہندوستانی کی پھانسی کا مقدمہ ہی کیوں نہ پیش ہو۔ پھر وہ گھر آئے گا اور یہاں غسل کرکے پھر چائے یا بسکٹ یا سیب اور انگور کھائے گا۔ پھر وہ اصالتاً یا کتے کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا کرکٹ، ٹینس یا ٹھنڈی سڑک یا بازار کی تفریح کو جائے گا اور جاکر رہے گا تاکہ ہلکا سا پسینہ اُسکے جسم سے پیدا ہو جائے۔ پھر وہ مغرب کی اذان کے بعد گھبرا کر غسل کرے گا۔ پھر وہ ڈنر، ضیافت، ایٹ ہوم یا صرف اپنے ننھے میاں کی والدہ کے ساتھ کھانا کھائے گا۔ پھر کچھ دیر اخبار، گپ، تاش بلیرڈ، قہقہہ، شراب، غور و فکر میں گزار کر پلنگ پر خفتہ باشد ہو جائے گا یا ہو جائے گی اور دوسری صبح پھر وہ

گذشتہ سے پیوستہ ہوجائے گا۔

یہ ہے انگریزوں کی وہ زندگی جسے قانونی زندگی کہا جاتا ہے یا کہنا چاہیئے بخلاف اسکے ہندوستانیوں کی زندگی میں قانون کی پابندی اس طرح نظر آتی ہے کہ وہ صبح سویرے نہ اٹھا ہے نہ اُٹھیگا یا کیوں اٹھے؟ یا کیوں اٹھایا جائے؟ یا کون اٹھائے؟ اور کیسے یا کون اٹھاتا ہے اور کس لئے اٹھائے؟ یا اٹھائے تو اسکی غرض؟ جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کون سنے؟ اور کسے پڑی ہے؟ پھر اگر وہ اٹھا بھی تو نصف گھنٹہ تک وہ کروٹیں ہی لیتا رہے گا یا لیکر رہے گا پھر وہ پلنگ پر بیٹھ تو جائے گا مگر اس طرح کہ ابھی اسکی آنکھیں بند ہونگی۔ پھر وہ اونگھنا شروع کرے گا یہاں تک کہ ایک مرتبہ وہ تکیہ پر سر رکھ ہی دیگا۔ وہ پھر اٹھے گا اور اب وہ کبھی کان پر ہاتھ مارے گا کبھی ناک پر مگر آنکھیں بند ہی رکھے گا۔ وہ اب پھر لیٹ جانے کی طرف مائل ہوگا اور لیجئے وہ پھر لیٹ گیا۔ اب پھر وہ ہوشیار ہوگا لیکن اسی گرانی کے ساتھ۔ اور جواب بھی اسکے پلنگ پر دھوپ نہیں آتی ہے تو وہ پھر سو جائے گا اور سو کر رہے گا۔ اب دھوپ آجانے یا خمار ختم ہوجانے کی وجہ سے وہ آنکھیں تو کھول دیگا مگر جنبش نہ کرے گا۔ صرف بہ آواز بلند جمائیاں لے گا اور پانی سے بھرے ہوئے لوٹے کی

پلنگ ہی پر سے دیکھے گا۔ اگر قریب تر نظر آگیا تو وہ اب حُقّے یا سگریٹ یا بیڑی کے کش لگائے گا اور پھر لوٹا لے کر میونسپل بورڈ جائے گا اور وہاں سر کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ایک مرتبہ پھر سوجانے کی کوشش کرے گا یا اونگھنے میں مصروف ہوجائے گا اور جو یہ کچھ نہیں تو صرف آنکھیں ضرور بند کرلے گا اور بند کرکے رہے گا۔ اب وہ میونسپل بورڈ کے دوسرے ممبر کی کھانسی یا ڈانٹ سنکر باہر آئے گا اور بقدر لضف مشک پانی سے صرف ہاتھ مُنھ دھوئے گا۔ گویا تمام دنیا کا غبار اسکے چہرے کو خراب کرگیا ہے۔ اس مُنھ دھلائی میں بقدر مقدرت خدام کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ ان کاموں میں دس بجے دن تک کا وقت گذر گیا۔ اب وہ گھر کے لوگوں سے گپ شپ کرے گا، کمرے میں آکر تاش کھیلے گا یا کھانا کھاکر نوکری پر جائے گا اور کوئی تین گھنٹہ کام کرکے پھر وہ لیٹ جانے کی فکر میں مصروف ہوجائے گا اور لیجئے وہ دوپہر کو کہیں لیٹ ہی گیا اور اگر دکان پر ہوگا تو چاہے گاہک بغیر خرید کئے واپس چلا جائے گا مگر وہ لیٹ کر رہے گا۔ اس طرح وہ چار بجے دن تک زندہ رہے گا اور اب وہ اس طرح گھر واپس آئے گا گویا چین وجاپان کو وہ اکیلا ہی فتح کرکے ابھی ابھی واپس آیا ہے۔ اس وقت گھر میں اس پر کام کرنے کی گرانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے کپڑے تک خود نہ اتارے گا۔ اور جو

افلاس کی وجہ سے ملازم نہ ہوگا تو وہ خود اتار لے گا مگر اس طرح کہ کپڑا بھی اپنی مقررہ جگہ پر نہ رکھے گا روہ اب کام کر کے آیا ہے اسلئے اسکی ہر بات میں غصہ ہوگا اور گھر والے آپس میں اشاروں میں کہدینگے کہ نوکری پر سے آرہے ہیں بات نہ کرو۔ اب وہ انگریزوں کی تقلید میں چائے نوش کرے گا اور پھر حقہ لے کر مکان کے باہر بیٹھ جائے گا اور تمام دوستوں کو دن بھر دفتر کے واقعات سنائے گا یا پھر وہ تفریح کو جائے گا۔ اب اگر باغ کی طرف نکل گیا یا ٹھنڈی سڑک پر تو گرانی کا یہ حال ہوگا کہ کوٹ یا شیروانی کے تمام بٹن کھول دیگا اور ٹوپی ہاتھ میں یا بغل میں رکھیگا قدم اس طرح اٹھائے گا گویا وہ اس سے پہلے کسی ٹانگے کا ٹٹو تھا اور اب اُس ٹانگے سے کھول کر ٹہلایا جارہا ہے۔ واپسی بجائے ٹھیک مغرب کے ٹھیک عشا کے وقت ہوگی اور جو راستہ میں کسی بے تکلف دوست نے کھانا بھی کھلادیا تو اب وہ شب کے بارہ تیرہ بجے ہی گھر واپس آئے گا۔

اس مربوط و مسلسل زندگی کے بعد اس کی متفرق قانونی زندگی یوں ہے کہ جس راستہ سے سپاہی جانے کو منع کرے گا وہ اسی راستہ سے گذرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر سواری میں روشنی لے کر جانے کا حکم ہوگا تو وہ بغیر روشنی کے سواری کو سپاہی کے سامنے سے گذر جانے کو بڑی زبردست فتح سمجھے گا۔ اگر دعوت یا نوکری کا وقت دس بجے

ہوگا تو وہ ہمیشہ گیارہ بجے پہنچے گا۔ البتہ ریلوے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہنچنے کی جگہ وہ ہمیشہ دو گھنٹے پہلے پہنچ جائے گا۔ اگر ریل کے کسی ڈبے میں صرف دس آدمی کی نشست کا قانون ہے تو یہ اس میں بیس اور پچیس ہوکر بیٹھے گا۔ مسجدوں میں سیدھی صف بنا کر نماز پڑھنے کا قانون ہے تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی صف بنا کر نماز پڑھے گا۔ اگر اسے اڈیٹر ہوکر کسی اخبار یا رسالہ کو پابندی سے شائع کرنا ہے تو یہ ہمیشہ ڈبل نمبر شائع کرے گا اور اعتذار میں صاف لکھ دیگا کہ اب دیر نہ ہوگی مگر پھر ہوگی۔ اگر وہ ریل کے ذریعہ کسی دوسرے شہر جائے گا تو ہمیشہ مقررہ دن سے ایک دن بعد پہنچے گا جب اسٹیشن پر ایک بھی استقبال کو نہ آئے۔ اگر وہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے تو کرایہ ہمیشہ دوسرے مہینہ ادا کرے گا۔ اور جو یہ ہندوستانی ہوا کہیں کا رئیس اعظم تب تو اس کی ساری زندگی میں قانون کا وجود ڈھونڈے نہ ملا ہے نہ ملے گا کیونکہ وہ تو ہے رئیس۔ اور رئیس کے لئے ویسے بھی قانون کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ کہ کہا ہے جرمن کے وزیر اعظم نے، خدا کرے اب ان لوگوں کو سوراج اور مل جائے پھر دیکھنا قانونی پابندیاں۔

نکات رموزی

غنودگی

انسان کے اندر "غنودگی" بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دنیا کے عظیم الشان مدبّر جلیل القدر سپہ سالار، باوقار علماء، صاحب عظمت وزراء اور شوکت پناہ شہنشاہ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں یعنی سب اونگھتے ہیں۔ غلط ہے کہ اسکی کیفیت کا نمایاں اثر افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ گانجا، چرس اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں۔ بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد بغیر پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو انسان دنیا و مافیہا سے یک لخت.........

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے کافی پایا۔ عمر، موسم اور قوائے جسمانی چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پچپاس برس کی عمر کے بعد لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکایک

۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر انھیں کسی نے زور سے آواز دی تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا ۔۔۔۔۔۔۔۔

موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدّت اختیار کر لیتا ہے۔ اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جانا محال ہو گیا ہے اور بعض بزرگ تو دستر خوان ہی پر ۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر قوائے جسمانی کے لحاظ سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ اسکے برعکس پاتے ہیں چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان تندرست آدمی کو سوار کر دیجئے اور چاہے جس موسم میں سوار کر دیجئے وہ ایک اسٹیشن تک تو کھڑکی سے مناظر قدرت کی سیر میں مصروف رہے گا مگر دوسرے اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلہ میں وہ کم از کم ایک سو مرتبہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر اسٹیشن پر "گاڑی تین منٹ ٹھہرے گی" کی آواز سے وہ بیدار بھی ہو جائے تو گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ پھر ۔۔۔۔۔۔۔۔ غنودگی کا غلبہ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے لیکن یہ بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے۔ جہاں غنودگی کے پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد۔ اور اسی لئے، اللہ بخشے، ہمارے بڑے مولوی صاحب، ریل میں اپنا صندوق اپنے کمربند سے باندھ کر

بیٹھتے تھے۔ دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے۔ جہاں آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا کہ ....! خصوصًا ایسے طلبہ پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جو انٹرنش کے امتحان کے لئے تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگرچہ نوجوان طلبہ بھی اسکے انسداد کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں مگر سب بے سود۔ مثلاً ہمارے ایک مستعد شاگرد نے غنودگی سے تنگ آکر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا جو اس حد تک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گئے لیکن اسکے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی ....! غصہ میں آکر انھوں نے انگریزی کرسیاں پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ اب غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ بے شبہہ وہ دیر تک پڑھتے رہے لیکن اسکے بعد اُنھوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جمادیں پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دیئے اور مطمئن تھے کہ غنودگی اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ .... ہم نے جا کر دیکھا تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا اور خود .... بیدار کیا تو جھنجھلا کر رہ گئے۔ منھ ہاتھ دھو کر آئے اور اس مرتبہ بہت زور زور سے چلا چلا کر پڑھنا شروع کیا مگر ابھی آواز میں کوئی دل پسند سر بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ ....

یہ تو تھے غنودگی کے نقصان رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو نماز باجماعت

اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں
امام صاحب کوئی طویل تر سورت پڑھتے ہیں لہذا اگر آپ مسجد کی صف
میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ
توہین ہو کر رہے گی۔ مثلاً جہاں امام صاحب الحمد شریف سے آگے بڑھے کہ
آپ کو تمام جسم میں ایک لطیف سنسنی محسوس ہو گی۔ آپ ایک پاؤں پر
کھڑے ہو جائینگے اور دوسرے پاؤں کو آرام دیجئے لیکن سنسنی بڑھتی
جائے گی اور آپ کی گردن خود بخود گریبان کی طرف جھک جائیگی
پھر کچھ دیر بعد آپ نیت باندھے پاس والے نمازی پر دھڑا
دھڑ........ اب اگر اس حالت میں امام نے رکوع کیا تو آپ کو
رکوع کرنا محال سا معلوم ہو گا مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دینگے
مگر رکوع کے لئے خمیدہ ہونا معلوم۔ اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب
امام صاحب ہاتھوں کو دوسرے سجدہ میں جانے کے لئے جنبش تو کرینگے
مگر درمیان ہی میں .... پھر کچھ سر اٹھا کر پڑھنا چاہینگے کہ.....
یہاں تک کہ امام صاحب سجدہ سے سر اٹھا لینگے تو آپ گھبرا کر یا تو
سجدہ میں بغیر امام کے چلے جائینگے یا نادم ہو کر ایک سجدہ پر قناعت
کر لینگے۔ ہمیں تو نماز باجماعت میں یہاں تک تجربہ ہے کہ امام صاحب
نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ مگر یہاں
قاعدہ اخیر ہی میں بیٹھے رہے۔ جب پاس والے نمازی نے کہنی مار کر

بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہو گئی۔ مگر فوراً سبحان اللہ اور الحمد للہ کہکر غنودگی کی خفت کو کم کیا جو ناکام رہی۔ اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب چلّا کر کہتے تھے کہ جب ایسی ہی نیند آتی ہے تو جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو؟ اور امراء نے شاید اسی لئے نماز جماعت ترک کر دی ہے؟

وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہوئی اور لوگوں میں گھر کر بیٹھ جائیے اور وعظ کہنے والے قسمت سے بریلی۔ بدایوں مرادآباد یا دیوبند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے بعد سے غنودگی کا سلسلہ یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور کبھی بند کرنا اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں محفل کی روشنی چہرہ تک نہیں آتی تو پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو جھکا دیتی ہے۔ پھر دونوں گھٹنے کھڑے کر لئے جاتے ہیں اور ان پر دونوں ہاتھ رکھ لئے جاتے ہیں اور اب جیسے ہی گردن جھکائی کہ --------- آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر ------

اس موقع پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سُن رہے ہیں اونگھتے نہیں ہیں۔ حالانکہ لمحہ بہ لمحہ ------ تا آنکہ وعظ ختم ہو گیا لیکن یہاں ہیں کہ -------- اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لئے کوئی دیوار ہاتھ آگئی تو پھر تمام محفل والے اپنے

اپنے گھر جا پہنچے۔ لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیئے ۔۔۔۔۔ آخر کار صاحب مکان آتا ہے اور کہتا ہے کہ اٹھئے صاحب یہ تبرک لیجئے تب کہیں ایک بڑی سی جمائی لے کر لاحول ولا کہتے ہیں اور بادلِ ناخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے۔

....

ہم کوئی حیدر آباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہل قلم تو نہیں ہیں کہ فکر معاش سے بالکل الگ رہ کر دن کی بہترین روشنی میں انشاء پردازی فرماتے رہیں۔ بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں دفتر کے "منشی جی" اِدھر شب کے ابتدائی حصہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ جب وہ سو جاتے ہیں اور وہ بھی سو جاتی ہیں تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں۔ کوئی ایک اوپر تیس اخباروں اور رسالوں کے لئے اس وقت مضامین تیار کرنے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس شب بیداری سے خدا معاف کرے صبح کی نماز ۔۔۔۔۔ مگر اس کو کیا کہیئے کہ دین دنیا کی وجہ نجات محترمہ والدہ صاحبہ اذانوں کے وقت سے اٹھانا شروع کر دیتی ہیں ادھر ممدوحہ کا رعب اور اثر اس قدر ہے کہ چوں نہیں کر سکتے ۔۔ جہاں ممدوحہ نے آواز دی "بھیّا" اور ہم فوراً "جی بہت اچھا" کہکر چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں مَل کر دیکھا کہ اماں جی کدھر ہیں اگر وہ اپنے کمرہ میں نماز کے لئے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے

ہمیں آلیا اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رخ کیا اور درمیان ہی میں ۔۔۔۔۔
مگر اماں بھی خوب جانتی ہیں کہ ہم آدھ گھنٹے تک اونگھتے رہتے ہیں۔
اس لئے وہ بھی آوازوں کا تار باندھ دیتی ہیں۔ جہاں ہمیں دیکھا کہ ہم ۔۔۔۔
کہ اُنھوں نے فوراً "ہوں ہوں" ۔۔۔ اور ہم فوراً تیزی سے ہوشیار تو
ہو گئے مگر پھر ۔۔۔۔۔۔۔۔ اب چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا دیئے۔
آنکھیں بند اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ پھر انھوں نے پکارا " بھیا سورج
نکلنے والا ہے" اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھکر جھومنا شروع کیا کہ
پھر " بھیا ۔۔۔۔۔" ہم فوراً سنبھل گئے۔ ایک دو مرتبہ منھ پہ ہاتھ پھیرا
کبھی داڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ
اب ننھے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا لاکر رکھ دیا۔ تو ہم نے
اُنھیں بہت غصّہ سے دیکھا۔ مگر انھوں نے اماں جی کو سنانے
کے لئے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا۔ " اُٹھتے کیوں نہیں ہو؟
بیٹھے اونگھ رہے ہو؟" وہ تو یہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے میں
بھاگ گئیں اور ہم جھنجلا کر لوٹا ہاتھ میں لئے گھر کے میونسپل
بورڈ کی طرف چلے۔ اب حسب دستور عام صبح چونکہ ہر گھر
کے میونسپل بورڈ میں حاجت مندوں کی کثرت ہوا کرتی ہے
لہٰذا اگر اندر سے کسی کے کھانسنے کی آواز آگئی تو ہم وہیں لوٹا
ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے اور لگے ۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ خاصی صبح

ہو گئی اور ہم ...... غرض ..... دُعا ہے کہ خدا صبح کی غنودگی سے ہر شریف آدمی کو بچائے۔ اگر دہلی کے بڑے .... حکیم جی اس کا نسخہ تجویز فرمائیں تو ایک بوتل کے خریدار ہم بھی ....

نکات رموزی

اَرہر کا کھیت!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے

دیہات میں اَرہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک لنڈن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی مہر، ہیر اور چیرز جوابِ رقصِ پروانہ" اور "پر فشانیٔ شمع" سے زیادہ گرمیٔ محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلہ مکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش فعلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہوجاتی ہیں لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹر لو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا۔ لیکن ارہر کے کھیت میں کتنے

گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گذرچکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کرجاتے ہیں جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک قضائے حاجت کرنا اور دوسرا ان کو اوبریشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کہر آلود ہوکر پھیلنے لگتا ہے، کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور انکے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کررہے ہیں۔ یعنی گھر پہنچکر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ ان کے مقابلہ میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی، اور دوسرے دن کی مشقت خوش آئند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے کسان کی بیوی، اسکے بچے بچیاں اور اسکا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لئے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لئے۔ کسان اور

مولیشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اس لئے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں۔ غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال میاں بیوی سے زیادہ خوش قسمت ہے خوش قسمت نہیں تو مسرور سہی۔

لیکن وہ دیکھئے گا۔ گاؤں کے قریب والے کنوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے جیسے کوئی کہن سال وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ۔ جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندان قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے یہاں کچھ دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں پر شباب لیکن بے خطر کنوئیں کی جگت پر تھیں پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیوں کو دعوت، تہدید و عتاب دیتی ہوئی، کچھ بوڑھیاں تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آپہونچا۔ نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی اور طراری سے اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے

یہ مجمع کھیت کی پگ ڈنڈی پر ہولیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی۔ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابل گذار اندیشہ ناک اور خاردار سدّ روئین کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیاحی میں
لیکن بعض ثقات جسکا شاید نام لینے سے گھبرائیں ۔ ادہر کا کھیت۔

ناظرین یہ سمجھ گئے ہونگے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لئے ہم چورن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظان صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرام جاں اور مونس قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اسکے لئے افتاں وخیزاں یہاں تک پہنچا ہے۔ اور کسی سے وعدہ دیدہ وانند کے مزید کا قول وقرار ہے۔ وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے۔ اور.... کسی کا گدھا کھو گیا ہے وہ بھی بھٹکتا ہوا آپہنچا ہے۔ یہ اسی بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ ادہر

بات ہے کہ کبھی گدہے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدہا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکوریڈ یا "جشن نقاب پوشی" کیا تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں۔ اور ہم روتے ہیں، یہ گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لئے موزون ہے۔ مہابھارت یا ارہر کا کھیت۔ مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے سالمن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

—..—..—..—..—..—..—..—

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں۔ ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانے میں ورنہ جیلخانے میں۔ جیلخانہ کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اسکے نوجوانوں نے اسراف شباب کے لئے شفاخانوں کو جیلخانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار آپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیلخانہ کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں شفاخانہ سے زندگی اور جیلخانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں۔ لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار "دشمن ایمان و آگہی"۔ یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ___؟

لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتظام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں سے عقل کی شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولہ سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شائد عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا۔

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اسکی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت۔ شہری اسکا قائل

ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حی و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اسکا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کے لئے اس نے چوپاٹی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے۔ آج چوپاٹی اور اپالو برباد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپاٹی اور اپالو تعمیر کریگا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں تنظیم آپ یہ اپالو اور چوپاٹی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر ــــ!

چوپاٹی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کے مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔

جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ارہر کے کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے۔ دارو غہ جی کیوں آئے اور کیا لیکر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا۔ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی پہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھوا ہوگا۔ اس پر اختلاف آرا ہوا اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوج موثر نہیں ہوتی۔ دونوں آگے بڑھیں۔ ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ لعوق حفظان صحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ منیا کے لڑکے مکندیا کا فعل تھا۔ دونوں نے مکندیا کو بیانگ دہل کوسا۔ یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکندیا گھبرا کر

اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا۔ دونوں چیخ پڑیں۔ مینا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا۔ سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ "خشک طہارت" کا خیال رہا نہ تر نجاست کا۔ ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ پچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورت، بچے، گیدڑ، کتے، بٹیریں، لومڑی، نیولا، بن بلاؤ ---------- گویا اسمبلی میں بم گرا!!

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں۔ بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا پانے والوں کے لئے اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہی ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اسی اثنا میں ایک کتا سامنے سے گذرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادہ "نقص امن" ہوئے گویا

اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسیٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لئے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گذرا اور ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔کیوں! اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی ہو گی؟۔ اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ میں ہامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا۔ بولا۔ میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا (خوانچہ کے اندر جو ابھی سر ہی پر رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے یہ لیجئے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسیٹی نے معلمین کے لئے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت خوانچہ والے اور "بریلی کے تحفہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے حاجی بلغ العلیٰ کچھ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "حبیب زیتونی"

ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" اور حال "ابوالمجنون" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت البزایہ" پر زور لگاتے رہے۔ ان دنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔ ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی، میں نے کہا کیا فرمایا، کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا سنیئے۔

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر بجلوہ ریزی "کمل" و "پریشانی ریش" اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتایئے تو مضمون لکھوں۔ فرمایا۔ ارہر کا کھیت میں نے دریافت کیا۔ کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ سخن فہمی کی داد دوں؟۔ کمل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا کاتبین پر ڈال دیا۔ میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب انکے نام ونشان، حسب ونسب، وطن ومشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیںگے۔ (مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جن نمبر میں کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ غلط مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا تو اب

صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا کون ؟ نواب مزمل اللہ خاں صاحب کیا یہ شعر سنائیے گا۔ کہنے لگے نہیں جی وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر۔ میں نے کہا انکو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنائیے گا۔

ترا کہ زور بہ بازوئے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آں حسرت کہن باقیست

فرمایا یہ کیا۔ میں نے کہا یہ ہے

من آں علم وہنر را بپر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر بے اختیار ہو کر فرمایا۔ ارے میاں یہ سب تو ہوا، اب کیا ہو؟ اچھا تمھارے کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمھارا لکچر سنونگا۔ میں نے کہا۔ اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہو گا۔ فرمایا۔ السلام علیکم۔

اسکے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا:۔

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔

(۲) اگر عنوان برا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔

(۳) اگر کتابت کی غلطی ہو تو نیاز صاحب ذمہ دار۔

(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار

خط و کتابت و ترسیل زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

پاسبان

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کر دی تھی اور غالب کے پرستاروں نے ہماری۔ ایک صاحب فرماتے ہیں غالب قومی شاعر تھے۔ دوسرے کہتے ہیں حیوان ظریف تھے۔ تیسرے کا قول ہے اہم غیب تھے چوتھے کا فلسفہ ہے فلسفی تھے۔ پانچواں کہتا ہے حرف مہمل تھے۔ ممتحن پوچھتا ہے کیا تھے؟ طلبا جواب دیتے ہیں۔

شامت اعمال ما صورت غالب گرفت

لیکن خود غالب کی شامت پاسبان تھے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بایں ہمہ غالب شاعری کو نہیں "سپہ گری" کو ذریعہ عزت سمجھتے تھے ممکن ہے کہ شاعری کے سال تکمیل کے لئے پانچویں یا ساتویں پشت کی مدت کافی ہوتی ہو۔ کم سے کم انیس نے تو اسے ثابت کر دیا۔ لیکن

سپہ گری کی تکمیل تو غالب سے سویں پشت تک نہ ہو سکی ورنہ

دل ہی تو سیاست درباں سے ڈر گیا

کے کیا معنی ؟

لیکن اصل یہ ہے کہ ہم خود غالب نہ ہونے کے باوجود پاسبان کے سامنے آپ کو (یہاں مطلب ناظرین سے نہیں، واحدِ متکلم سے ہے) کچھ گدا گر ہی سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ البتہ خیریت یہ رہی کہ پاسبان کے قدم لینے کی غلطی کبھی نہیں کی۔ آپ کسی شخص، چیز یا موقع کا تصور نہیں کر سکتے جو پاسبان سے خالی ہو۔

ایک بار یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا، دو چیزیں ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں کیسے موجود ہو سکتی ہیں میں نے کہا۔ کیوں نہیں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا کیسے ؟ میں نے کہا اور منطقی کسے کہتے ہیں۔ ابھی ابھی منطقی نے میرے نظریہ کو ثابت نہیں کیا تھا کہ ایک بزرگ (یہاں بزرگ سے مرد معقول نہیں بلکہ مرد مسن مراد ہے) بول اٹھے۔ میاں چاہے کچھ کہو، ہندوستان کی نجات تو پاسبان سے ہے۔ منطقی نے کہا بحث غیر متعلق ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی نجات کا سوال۔ ایک خاں صاحب شطرنج کھیل رہے تھے بولے برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا اور یہ کہتے ہوئے مہرے کو دبا کر آگے کھسکایا اور پھر بولے برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔

منطقی نے برافروختہ ہو کر کہا۔ جناب خاں صاحب آپ اخلاقی اور منطقی دونوں غلطیوں کے ساتھ مرتکب ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف حریف شاطر ایک لالہ جی تھے۔ انھوں نے اپنا مہرہ بڑھاتے ہوئے فرمایا، برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔ اب خان صاحب کی باری تھی انھوں نے بھی چال چلتے ہوئے یہی فقرہ دہرایا۔ لالہ جی نے دوسری چال چلی اور اسی فقرہ سے جواب دیا۔ جیسی چال ہوتی، موقع پڑتا یا طور تیور سے چلتے اسی انداز سے مہرے دبا کر، اٹھا کر، بسرعت یا با احتیاط مہروں کو نکال بھی دی جاتی اور اسی لب و لہجہ، جرات، حلم، مسکینی، طنز یا ظرافت کے ساتھ برخوردار والا فقرہ دہرایا جاتا۔ یہاں تک کہ دونوں کے پیادے، رخ اور فرزی سب بننے کے لئے جلد جلد بڑھنے لگے۔ برخوردار والا فقرہ بھی جلد جلد دہرایا جانے لگا۔ لالہ جی کا فرزی پہلے تھا۔ خاں صاحب نے کہا۔ برخوردار تم نے بے ایمانی کی۔ لالہ جی نے کہا برخوردار بے ایمان پر تین حرف۔ اب دونوں نے مزید خانگی رشتے جوڑنے شروع کئے چنانچہ خاں صاحب نے بساط اور لالہ جی نے ناریل سے برخوردار کو بدل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بساط منطقی کے سر پر، چلم منطقی کے آغوش میں اور پولیس کا سپاہی حاضرین وسط میں۔

ایک دن بالادست سے ملنے گیا۔ میں بڑے لوگوں سے ملنے میں ذرا اعتدال پسند واقع ہوا ہوں اور محض اس خیال سے کہ بڑے لوگوں کے

خفیہ اور ان کے پاسبانوں کے علانیہ سلوک سے بہت ڈرتا ہوں لیکن کیا کرتا تہوار کا دن، کپڑے اچھے اور ستھرے "ایسا موقع کب ملتا تھا۔ چنانچہ احاطہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ڈبلو کالے کتے نے لپک کر خوش آمدید اس لہجہ میں کہا کہ میں قطعاً بھول گیا کہ نئے جوتے پہن کر بھاگنا خصوصاً ایسی حالت میں جب نئے کپڑے پہننے کی توفیق اور بھاگنے کی مشق نہ ہو' نہایت درجہ غیر شاعرانہ اور غیر محفوظ حرکت ہے وہ بھی جبکہ شیروانی کا دامن شرعی پائجامہ کی مہری سے مائل بہ اختلاط، انگریزی جوتے کا تلا نیا، سڑک پرانی اور کتا بے تکلفی پر آمادہ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فاصلہ اور سرعت رفتار میں عمودی حرکت افقی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بھاگنے والا یک لخت حکیم آئن سٹائن بن جاتا ہے اور فطرت نے ہندوستانیوں کو جس تخریب الطرفین چرمی کھدر میں ملبوس کیا ہو وہ بقدر بستر و ناراں نما کہنی گھٹنے اور ٹھوڑی سے غائب ہو جاتا ہے بقول غالب بہ نسخۂ دیگر

کہنیاں فگار اپنی گھٹنا خوں چکاں اپنا

میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ واقعات مجھے پیش آئے ہیں نے صرف امکان وقوع کا اشارہ کیا ہے۔ اسکے اظہار کی ضرورت یوں سمجھتا ہوں کہ بعض بد مذاق یا ستم ظریف یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ یا تو لکھنے والے پر گذرتا ہے یا پڑھنے اور سننے والے پر صادق آتا ہے۔ یہ سب صحیح، لیکن واقعہ ہے کہ میں کتے سے یوں بھی کچھ ڈرتا ہوں اور یہ میرے اور کتے کے نجی معاملات ہیں جن سے

ناظرین کو دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن اس میں ہم دونوں کی پوزیشن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے میں ان کا تذکرہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں تو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ میں کم سے کم جہاں تک کتوں کا تعلق ہے کچھ بہت زیادہ دلیر بننا پسند نہیں کرتا۔ اور دلیر بننا یا نہ بننا قطعاً ذوقی چیز ہے اور میرے نزدیک ہر ذوقی چیز قابل درگذر ہے خواہ وہ عمر طبعی پر پہنچکر شادی کرنا ہو یا لیڈری سے روٹی کمانا ہو۔ خیر تو میں کہتا تھا کہ کتے مجھے پسند نہیں ہیں۔ میں نے کالے کتے سے آخر میں صلح کر لی۔ یعنی بھئی تم کو تمھاری کوٹھی اور مجھے اپنا جھونپڑا مبارک۔ لیکن یہ کتے کی غلطی تھی کہ اس نے دب کر صلح کرنے والے کی خلوص نیت کا یقین کر لیا۔

میں نے واپس آکر اپنے ایک عزیز دوست سے کہا ایک صاحب تمھارا کتا خریدنا چاہتے ہیں اپنے آدمی کو ساتھ کر دو کہ میں دکھلاؤں۔ انھوں نے اپنے پہلوان کتے اور مریض نوکر کو ساتھ کر دیا۔ میں ذرا اطمینان سے جائے فرار پر واپس آیا۔ ہمارے دوست نے ہم کو دیکھا۔ یہ معلوم نہیں میرے مسکرانے پر وہ غرائے یا ان کے غرانے پر میں مسکرایا۔ ہمارے دوست کو اسکی خبر نہ تھی کہ اس وقت ان کا مقابلہ پسر نوح اور اصحاب کہف دونوں سے تھا۔ انھوں نے جست کر کے معانقہ کرنا چاہا لیکن بجائے اسکے کہ میرا گلا اور انکا دندان مبارک ہوتا خود ان کا ٹیٹوا ہمارے نو آمارہ مہمان کے منھ میں تھا جو میرے پیچھے گلزار نسیم بنے کھڑے تھے۔

دانت اسکے تھے گورکن قضا کے ؎ دو نھنے رہ عدم کے ناکے

نوکر پہلے بھاگ چکا تھا۔ میں نے دونوں دوستوں کو تخلیہ میں سر سید کا مضمون بحث و تکرار بہ آواز بلند اسٹیج کرتے چھوڑا اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔

ایک بار مجھے دور دراز سفر کرنا پڑا۔ خیال آیا روپے کم ہیں اور سفر طویل، سبیل ایسی کرنی چاہیئے کہ یا تو سفر مختصر ہو جائے یا روپے فراہم ہو جائیں مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اسکا پروگرام بناتا ہوں چنانچہ جب تہائی سفر اور روپیہ ختم ہو گیا تو خیال آیا۔ یہاں پہنچکر آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ کام شروع کرنے کے بعد پروگرام ہی کیوں بناؤ۔ میں کہتا ہوں یہ کمزوری ہے اور اپنی کمزوری تسلیم کرنے کے بعد آپ جتنی حماقتیں یا مظالم چاہیں کر سکتے ہیں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں لیکن اسکے لئے ضروری ہے کہ آپ بڑے آدمی ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں موچی (بعض وہ لوگ جو موچی نہیں چمار کا لفظ استعمال کرتے ہیں) کو عرش پر بھی بیگار ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن آپ یہاں جائز طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آپ خود بڑے ہیں یا موچی۔ اس سوال کا جواب دینے سے مجھے انکار ہے اسلئے کہ ضابطۂ فوجداری میں آیا ہے کہ کوئی شخص ایسا بیان دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کے جواب میں اسکے مجرم قرار دیئے جانے کا احتمال ہو۔ بڑا آدمی بننا لطف کی بات ضرور ہے لیکن اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ اکثر بڑھاپے میں شادی کرنا پڑتا ہے یا ایک طویل

فاقہ۔ اور کیا ہوا اگر میرے بڑا ہوتے ہوئے بڑے آدمیوں سے دونوں چیزوں کا بیک وقت مطالبہ کیا جانے لگے۔

میرے لئے یہ اکتفا کرتا ہے کہ میں کہدوں کہ جب میرے ذہن میں پروگرام آگیا تو اس پر ضرور عمل کیا جائے گا۔ خواہ کام جس سے وہ پروگرام متعلق ہو ختم ہی ہو چکا ہو۔ اس بارے میں میں شعرا کا مقلد ہوں۔ کوئی خیال آگیا تو وہ باندھا ضرور جائیگا۔ خواہ اس حرکت پر لوگوں کو اپنا کرایہ دیکر شاعر صاحب کو بیٹھے ہی کیوں نہ آنا پڑے۔ بہرحال راستے میں ایک مشہور درگاہ تھی۔ میں نے کہا پہلے یہیں قسمت آزمائی جائے۔

اسباب سرائے میں رکھا اور میں درگاہ پہنچا۔ درگاہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی اور وہاں کے پاسبانوں کو دیکھ کر جان ومال کا اندیشہ ہوا۔ نہایت لمبی چوڑی، عالی شان عمارت، فربہ اندام فقیر، لحیم وشحیم مجاور۔ عمارت سے زیادہ فقیر گندے اور فقیروں سے زیادہ عمارت گندی۔ یہاں پہنچکر خیال آیا کہ پروگرام تو بنایا نہیں۔ سوچا کہیں بیٹھ کر قوالی شروع کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ نہ اشعار یاد ہیں اور نہ گانا آتا ہے۔ تالی بجانے کی مشق کالج میں تھی لیکن وہاں کی اور یہاں کی تالی میں فرق ہے اور اس فرق کو لوگوں نے محسوس کر لیا تو یہاں کوئی ایسا تو ہے نہیں جو اس کا قائل ہو کہ تالیاں صرف دونوں ہاتھوں سے بج سکتی ہیں۔ ممکن ہے یہاں کی تالی کا یہ چیدہ ترکیب استعمال یہ ہو کہ ہاتھ ان کا

اور کسی غریب الدیار کی طبلی۔ تھوڑی دیر تک دماغ پر زور دیتا رہا۔ معاً خیال آیا کہ گو اشعار، تالی اور قوالی کچھ نہیں آتی لیکن قوالی کی ایک گیت آتی ہے یعنی

"اہے وائے!"

چنانچہ اہے دلئے کچھ سوچتا، کچھ گنگناتا داخل عمارت ہوا۔ پہلے پاسبان نے پکارا اور اس طور پر کہ ساری عمارت گونج گئی۔ "قدم درویشاں رد بلا" اور نہایت تپاک سے فیس داخلہ طلب کی۔ میں نے کہا جناب پیسے ہوتے تو وطن کیوں چھوڑتا۔ یہاں اس نیت سے آیا ہوں کہ حضرت کے فیض سے کچھ پیسے مل جائینگے۔ فرمایا خدا نہ کرے۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ میں نے کہا آپ نے میرے بارے میں غلط رائے قائم کی ہے میں صرف عیال دار مفلس ہوں اور آپ چاہیں تو نتیجتہً مقروض اور مریض بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کہنے لگے یہ سب صحیح لیکن جب تک کچھ خیر خیرات نہ کیجئے گا حضرت کی خوشنودی کیونکر حاصل کیجئے گا کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ میں نے عرض کیا حضور والا یہ مزار شریف ہے یا امپیریل بنک۔ پاسبان نے اب کچھ اس طور پر گھورا کہ مارے خوف کے قالب سینہ میں اور چونّی جیب میں لرزنے لگی۔ میں نے چونّی دربان کے نذر کی اور "اہے ولئے" کہتا ہوا چار سو رماؤں کی معیت میں آگے بڑھا۔ ایک مقام پر طائفہ کھڑا ہو گیا حکم ہوا کہ یہاں حضرت نے وضو کیا تھا، اکنّی رکھ دو۔ میں نے رکھ دی۔

اکنی کے ساتھ ایک بزرگ ڈھے گئے۔ دوسری منزل پر بتایا گیا کہ حضرت نے یہاں چلّہ کھینچا تھا۔ ۸۔آنہ پیش کرو۔ وہ بھی پیش کر دیئے گئے۔ ایک صاحب اور کم ہوئے۔

چلتے چلتے ایک اور مقام پر پہنچے۔ ارشاد ہوا بارہ آنہ رکھو۔ حضور نے یہاں دعا مانگی تھی تم بھی مانگ لو۔ میں نے کہا۔ کچھ آپ بتا سکتے ہیں حضور نے کیا دعا مانگی تھی۔ کہنے لگے۔ یہی مانگی ہوگی کہ خدا مسلمانوں کو جملہ آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ میں نے کہا ہے وائے دعا کب مقبول ہوئی کہ میں بھی مانگوں اس پر ہمارے دوست و رہبر یک لخت چراغ پا ہوگئے۔ اور قریب تھا کہ مزار شریف مشہد مقدس بن جائے کہ میں نے انکے ہاتھ پر مطلوبہ رقم رکھ دی جس کا کرشمہ یہ تھا کہ ان کا سارا ولولہ جہاد مزاج شریف اور دعائے لطیف پر ختم ہوگیا۔ پوچھنے لگے حضرت آپ کا آنا کہاں سے ہوا۔ میں نے کہا جناب ٹمبکٹو سے آرہا ہوں۔ فرمایا وہاں مزارات ہیں؟ میں نے کہا جہاں کہیں مسلمان ہیں مزارات ہیں۔ دریافت کیا متولی اور سجادہ نشین کون ہیں؟ میں نے کہا فی الحال تو میں ہی ہوں اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے کے لئے ہندوستان آیا ہوں۔ پوچھا اوقاف کی آمدنی کیسی ہے۔ میں نے کہا کافی سے زیادہ۔ کہنے لگے اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ یہاں کی حالت تو نہایت زار ہے۔ متولی صاحب پر ایک عورت اور ایک انگریز کا بڑا اثر ہے۔ مزار شریف کی ساری آمدنی انہیں پر صرف ہوتی ہے۔ ہم خدام تو

اسی روکھی پھیکی پر بسر کرتے ہیں جو آپ لوگوں سے مل جاتی ہے۔ میں نے کہا بھئی انگریز اور عورت سے کیسے اور کہاں مفر ہے۔ اسکے بعد جو گفتگو ہوئی وہ اس قسم کی تھی کہ اس کا تذکرہ نامناسب ہے...... چنانچہ ہم اپنے دوست سے جدا ہوئے اور آخری بزرگ کی معیت میں آگے بڑھے۔

آخر میں ہم دونوں ایک کھڑکی کے قریب پہنچے۔ اچھا اب ایک روپیہ نذر کیجئے اور اس کھڑکی میں منھ ڈال کر دعا مانگئے، قبول ہوگی۔ میں نے کہا جناب یہ ایک روپیہ نقد حاضر ہے، میں دعا سے باز آیا۔ کہنے لگے۔ نہیں جناب یہ یہاں کا دستور ہے آپ مزار شریف کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی توہین نہیں کرتا۔ اُہے وائے حواس مختل ہیں۔ کہیں اُلٹی سیدھی دُعا مانگ گیا تو ہم یا تم خواہ مخواہ بندھے پھرینگے۔ کہنے لگے ہرگز نہیں۔ اس آستانہ سے کوئی محروم نہیں پھرا۔ میں کھڑکی میں منھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے رفیق نے سوچا کہ یہ شخص ٹال رہا ہے۔ فرمایا دعا مانگو۔ میں نے کہا مانگ تو رہا ہوں۔ کہنے لگے ہم سے کیا پردہ زور سے دعا مانگو۔ میں نے کہا آپ سے کیا تکلف۔ لیکن زور سے مانگوں تو ممکن ہے کہیں مکین مزار کی عافیت میں خلل ہو۔ فرمایا اس کا خیال نہ کرو ہم سنبھال لینگے۔ میں نے دعا مانگی جس میں رقت، خفت اور خفگی سب کچھ شامل تھی۔

"اے برگزیدہ روح، دعا کیجئے اس گناہگار اور کم بخت ہستی کو آج سے پھر کسی مزار یا مجاور سے سابقہ نہ پڑے۔"

مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں نے گردن باہر نکالی یا اس بارے میں مجھے اپنے رفیق کا احسان مند ہونا پڑا۔ لیکن اسکے بعد میں تنہا مزار شریف سے باہر آیا۔ بعض فقرا اور مساکین نے میرے ساتھ ہمدردی کرنا چاہی لیکن ہمارے آخری کرمفرمانے وہیں سے للکارا، خبردار! وہابی ہے وہابی!

میں نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ سرائے میں پہنچا تو سامان غائب!

"اَہے وائے"!! ایک صاحب نے بڑی دعاؤں اور التجاؤں کے بعد ایک رفیقۂ حیات کو پایا۔ عہد زفاف منانے کے لئے کسی مقام پر پہنچے۔ عروس کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ ارشاد ہوا تم کیسے احمق ہو جو ایسی جگہ لائے۔ غریب نے دبی زبان سے کہا جانِ من جگہ کا انتخاب تو تمھیں نے کیا تھا۔ خطاب ہوا لیکن تم نے اختلاف کیوں نہیں کیا۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کی نصف مصیبتیں محض اس لئے ہیں کہ بابا آدم اپنی سالم پسلیوں کے ساتھ سپرد خاک نہیں ہوئے اور غالباً جس بنا پر عربی میں اندھے کو بصیر کہتے ہیں اسی بنا پر انگریزی میں بیوی کو نصف بہتر کہتے ہیں۔ مجھے اس نصف بہتر کی افسانوی شان نزول نہیں معلوم ہے اسکا سبب یہ ہے کہ ہمارے "نصف بہتر" نے ہم کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ اس بارہ میں گورکندن اور استخواں برآوردن (ریسرچ) پر عمل کر سکتا۔ ایک چیز البتہ ذہن میں آتی ہے۔ یعنی اگر

شوہر اور بیوی مل کر ایک ہوئے تو نصف بہتر بیوی ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں اخلاقیات اور وظائف الاعضاء میں تصادم ہوتا ہے۔ اِس بارہ میں میرا نظریہ پدریہ یہ ہے کہ نصف بہتر یا نصف بدتر کا اطلاق والد اور والدہ سے اتنا متعلق نہیں ہے جتنا نورِ چشم اور نورِ چشمی سے!

لیکن یہاں اب تک جو کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے وہ کچھ غیر متعلق سا ہی سوال یا سیان کا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں موضوع زیرِ بحث سے نہایت طول طویل انحراف ہو گیا ہے۔ لیکن یہ انکشاف خود راقم السطور کا ہے ناظرین میرے اعتراف سے قبل اس کا احساس خود بخود کبھی نہیں کر سکتے تھے یہ بھی انشا پردازی اور سخن سرائی کا ایک گر ہے۔ استادوں نے ایک گر تو یہ بتایا ہے کہ مخاطب کو احمق سمجھو اور پھر تم کو حماقت کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوگی۔ دوسرا گر یہ ہے کہ بکواس یا لکھواس (برعایت قافیہ) کئے جاؤ۔ البتہ موقع بہ موقع عنوان یا مبحث کو دہرا دیا کرو، بیڑا پار ہے۔ لیکن میں مخاطب حضرات کو ایسا نہیں سمجھتا جیسا مجھ سے بہتر لوگوں نے ان کو سمجھا ہے۔ تاہم ان کے لئے اتنی رعایت گوارہ کر لونگا یا کبھی کبھی ان کو بتا دیا کرونگا کہ موضوع زیر بحث کیا ہے۔ تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا سدِ راہ نہ پردہ ہے اور نہ پیانو چنانچہ ان حیثیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ حکم آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ

عورت انگریزی ہو خواہ سوراجی۔ وہ پاسبان اور خفیہ پولیس دونوں ہے۔
جس طرح بات کرتے ہیں کبھی کوئی فقرہ ایسا نکل جاتا ہے جسکا انجام عبرتناک
اور مداوا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض فقرے کبھی قلم سے بھی ایسے نکل
جاتے ہیں جن کی مکافات بھگتنا ہی پڑتی ہے بالخصوص ایسی حالت میں
جب معاملہ انگریز اور عورت دونوں سے اٹکا ہو تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ
انگریز اور عورت دونوں ایسی چیزیں ہیں جن سے مرد معقول ڈرا کرتے ہیں
چہ جائیکہ انگریز عورت ہو یا عورت انگریز۔ بہرحال اس وقت عورت کی
انگریزیت یا جنسیت کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا۔ میں اسوقت اسکی
سوراجی حیثیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں یعنی اس سوراج سے جو اسے اپنے
گھروں میں حاصل ہے۔ ہندوستان کے سوراج اور ہندوستان کے گھریلو
سوراج میں بہت بڑا فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ ہندوستان
کے سوراج میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں۔ گھریلو سوراج میں مرد
کی حیثیت بالکل پورن راج کی ہے۔ پورن راج کے بارے میں سنا جاتا
ہے کہ یہ وہ چیز ہوگی جسکے بارہ میں کہا ہے۔

کسے را با کسے کارے نباشد

چنانچہ گھریلو سوراج میں مرد کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ مرد کو نکما
چھوڑ دیا جائے تو دنیا کو نقصان کے بجائے فائدہ ہی پہنچے۔ لیکن
مشکل یہ ہے کہ اس کا از کار رفتہ ہونا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ آپ

کہینگے نکمّا اور از کار رفتہ ہونا ایک ہی چیز نہیں ہے لیکن یہاں سوال طب یا لغت کا نہیں ہے سوال صرف ہندوستانی اکیڈمی کا ہے اور بس!

عورت جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے متجسس اور پاسبان' دونوں ہے اسکو اس کا فکر نہیں کہ مرد روپیہ کس طور پر کماتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کیوں کرتا ہے۔ یہ بات بجائے خود قابل سوز خوانی نہیں، رقت تو اسی پر آتی ہی کہ اس کا خرچ کرنے کا تصور وہی ہے جو آئی' سی' ایس اور برطانوی اقتدار کا ہے یعنی ہر فعل جو آئی' سی' ایس کرتا ہے برطانوی اقتدار میں معین ہوتا ہی اور ہر وہ فعل جو کسی ہندوستانی تعلیم یافتہ سے سرزد ہوتا ہی برطانوی اقتدار کے منافی ہے۔ وہ مرد کے مخلص ترین دوست کو اپنے سب سے نکمّے رشتہ دار سے بدتر سمجھتی ہے اور اپنے ہر فعل کے جواز میں کسی نہ کسی طور اس حقیقت کو جتا دیا کریگی کہ تم سے شادی کرنے میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی کی ہے اور اس کے ثبوت میں دعوٰی یہ پیش کریگی کہ فلاں بیوی کے پاس مرغی، طوطے، بندر، بھالو پلے ہوئے ہیں اور تمھارے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اب اگر یہ کہیے کہ آپ کے اعزّا اور سات پشت اس کام کو کرتے آئے ہیں، کیا ہرج اگر آپ کی دلچسپیوں کی جولان گاہ ان سے مختلف ہو تو پھر دیکھیے شوہر کو مسلم لیگ قسم کی صدارت کس کس طور پر تفویض ہوتی ہے۔

متجسس اور پاسبان کبھی قانع نہیں ہوسکتا۔ یہی حالت عورت کی ہے اس کی ساری زندگی مسلسل تفتیش اور تذبذب ہے۔ دولت اور شہرت کو وہ پسند کرتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس سے اسکو آرام پہنچتا ہے مادی اور غیر مادی بلکہ یہ چیزیں اسکو اس لئے عزیز ہیں کہ ان سے وہ دوسری عورت کو شرمندہ کرسکتی ہے یا زیر رکھ سکتی ہے لیکن اسکا تفوق کا وہ تصور وہ نہیں ہے جو مردوں کا ہوتا ہے یعنی وہ دوسروں کی برتری کی قائل نہ ہوگی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری تصور کر کے اپنے پندار تجبّر کی پرورش کرتی رہے گی۔ وہ اپنی خوش قسمتی یا خوش وقتی سے مسرور اور مطمئن نہ ہوگی بلکہ دوسروں کی۔ بشرطیکہ وہ اسکے رشتہ دار نہیں ہیں کمزوری یا بدحالی سے مطمئن رہے گی۔

گھر میں اسے کوتوال کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسا کوتوال جس سے بدمعاش اور نیک معاش فکرمند رہتے ہوں۔ شوہر کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کا نام درج رجسٹر نمبر ۱۰ میں ہوتا ہے۔ پولیس والے اس امر کا پتہ لگایا کرتے ہیں کہ نمبر ۱۰ قسم کے لوگوں سے کون لوگ ملنے آتے ہیں۔ یہ کن لوگوں سے ملتا ہے۔ اسکا اور اسکے ملنے والوں کا ذریعہ معاش کیا ہے کتنی دفعہ اسکے چالان ہوئے ہیں اور کتنی بار اور چالان ہونے کا امکان ہے اس سے روپیہ کہاں تک اینٹھے جا سکتے ہیں۔

شوہر کے دوست آئے اور اس نے بغاوت کیا۔ نکمے۔ نکھٹو

چین ہی نہیں لینے دیتے۔ ہاہا ہی ہی کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ پان لاؤ، پتے لاؤ، پانی پلاؤ۔ نہ دن کو عافیت نہ رات کو چین۔ دوست کی آمد کی اطلاع ہو تو شوہر نے باہر جانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ نیک بخت بولیں۔ دیکھو چہرے پر بحالی آگئی۔ اب تک تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے سوکھا کریلا۔ اب وہاں سے حکم چلے گا یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ مجھے کہیں پڑی گری لائے تھے اور کیا یہ اولاد میں اپنے گھر سے لائی۔ اتنے میں کوئی بچہ کوئی مطالبہ یا شکایت لے کر پہنچا اسے دوہتڑ شوہر کو کھکڑ۔

اگر وہ پردہ کی حمایت کرتی ہے تو صرف اس مفاہمہ پر کہ اگر عورت پردہ چھوڑے تو مرد بالخصوص اسکا شوہر اسے اختیار کرے یعنی ہر عورت کو اسکا حق حاصل ہو کہ وہ آزاد ہو لیکن شوہر کو اسکی اجازت نہیں ہے کہ وہ سوائے اپنی بیوی کے دوسری عورتوں کی آزادی پر خوش ہو اس میں عورت حق بجانب ہے۔ کیونکہ اس بارے میں بعض مردوں کی بھی ذہنیت یہی ہے کہ اپنی بیوی کے علاوہ ہر عورت آزاد یا بے پردہ ہو تو بہتر ہے۔

عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ ہوا۔ جیلخانہ۔ ہسپتال، فنون لطیفہ، مضمون نویسی اُکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اسی کی منت کش ہیں۔

۴۲۰
"چار سَو بِیس"

سولہ سترہ سال غیر ممالک میں رہنے کے بعد جب میں ہندوستان واپس آیا تو میں نے ایک اخبار میں "شری ۴۲۰" لکھا تھا، دیکھا۔ میں نے شری رامچندر جی، شری بھگوان تو ہزار دیکھا تھا لیکن "شری ۴۲۰" کے معنی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر یہ خیال کر کے خاموش ہو رہا کہ جس طرح مسلمان چھٹی لکھتے وقت اسکی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بجائے ۷۸۶ سے کرتے ہیں اسی طرح ۴۲۰ میں کسی متبرک ہستی کا نام ہے جسے الفاظ کی بجائے اعداد میں لکھا جاتا ہے۔

چند روز بعد میں نے ٹرین میں دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا ایک کہہ رہا تھا ارے بھئی تمھارا کوچہ بیٹا رنگان والا دوست تو بڑا ۴۲۰ ہے۔ میں یہاں بھی "ابجدی گفتگو" سن کر حیران ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ۴۲۰ کیا بلا ہے؟ آخر جب ہر روز ایک دو دفعہ ۴۲۰ سننے لگا تو مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ کسی شریف آدمی سے اسکا مطلب دریافت کروں آخر ایک روز میں نے ایک شخص سے پوچھ ہی لیا کہ صاحب ۴۲۰ کسے

کہتے ہیں۔ اس بھلے مانس نے چیں بہ جبیں ہو کر میرے چہرے کی طرف اس طرح دیکھا گویا میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ تیری ایسی تیسی، چولسنی ہینسی لیکن شاید اس کی نظر میری معصومیت کو بھانپ گئی ہوگی۔ اس لئے اس نے مسکرا کر کہا "حیرت ہے کہ آپ ابھی تک ۴۲۰ نہیں جانتے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کبھی کسی ۴۲۰ سے پالا نہیں پڑا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ ۴۲۰ تعزیرات ہند کی ایک دفعہ ہے جو فریب کاروں اور جعلسازوں پر عائد کی جاتی ہے اور اس دفعہ کے ماتحت انھیں سزا ملتی ہے۔ یہ سنکر میں خوش تو اس لئے ہوا کہ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے اور ہر شخص تعزیرات ہند کی دفعات جاننے لگ گیا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہوا کہ دفعہ ۴۲۰ سے دیہاتی تک بھی آشنا ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب فریب کاری اور جعلسازی بہت عام ہوگئی ہے۔

ایک روز میں دہلی جا رہا تھا۔ ٹرین میں ایک ٹی ٹی صاحب ٹکٹوں کا معائنہ کرنے آئے میں نے دیکھا کہ انکے کندھے پر ۴۲۰ لکھا ہے۔ میں نے ازراہ تفنن عرض کیا "کہیئے بابو ۴۲۰ صاحب، کیا حال ہے؟" بابو صاحب مسکرائے اور بولے "اجی حضرت کیا کیا جائے خود سرکار نے ۴۲۰ بنا رکھا ہے ورنہ یہ خاکسار تو ۴۲۰ نہیں۔" یہ دیکھ کر مجھے خیال پیدا ہوا کہ جس شخص کا

ٹیلیفون نمبر ۴۲۰ ہو گا تو اس بیچارے کی زندگی بھی کیا ہو گی؟ جب وہ کسی کو اپنا ٹیلیفون نمبر بتاتا ہو گا تو سنتے ہی مذاق سمجھتا ہو گا۔ پھر وہ پولیس والا جس کی بیٹی پر ۴۲۰ لکھا ہو گا، فریب کاری وارداتوں میں کس منہ سے تفتیش کرتا ہو گا؟ جب وہ کسی شخص کو دفعہ ۴۲۰ کا ملزم گردانتا ہو گا تو اُسے یہ جواب نہ ملتا ہو گا کہ جناب آپ ۴۲۰ ہیں۔

بہر حال آہستہ آہستہ تجربہ ہوتا گیا تو مجھ پر یہ آشکارا ہونے لگا کہ ملک میں ہر طرف ۴۲۰ کا دور دورہ ہے اور پہلے تو دنیا" بہ امید قائم" ہوا کرتی تھی لیکن آج کل دنیا بہ ۴۲۰ قائم ہے۔

ایک واقعہ مجھ سے بھی سنیئے۔ جسکا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ۴۲۰ کرنے والے بزرگوار ایک روزانہ اخبار کے مالک ہیں جو اپنا مقصد زندگی خدمت قوم و وطن بتانے کے عادی ہیں اور پھر ۴۲۰۔ ایسی مکمل ہے کہ نہ کوتوال کا ڈر نہ قاضی شہر کا خدشہ۔

شمالی ہندوستان کے ایک مسلمان بنیئے کو خدمت قوم کا شوق چرایا اور ایک اخبار نویس کے انگیجنٹ پر اس نے روزانہ اخبار نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ بنیئے کے لئے تو سرمایہ کا سوال مشکل نہ تھا لیکن موزون چیف اڈیٹر کا ملنا دشوار تھا۔ اتفاق کی بات کہ ان دنوں ایک مشہور اخبار کا چیف اڈیٹر علی محمد خاں رند بے کار تھا بلکہ اسکے سابقہ رفقائے کار بھی تلاش معاش میں

سرگرداں تھے بنیئے کو پتہ چلا تو اس نے چیف اڈیٹر صاحب سے ملاقات کی۔ معاملہ کی گفتگو ہوئی اور بنیئے نے کہا کہ صاحب نیا نیا کام ہے ابھی میں زیادہ تنخواہ نہیں دے سکونگا اگر آپ سو روپئے ماہوار اور منافع کا ۲۰ فیصدی قبول فرمائیں تو کام شروع کر دیا جائے۔ اڈیٹر نے کہا کہ سوچ کر کل بتاؤنگا۔

اڈیٹر صاحب نے گھر جاکر بیوی کو مژدہ سنایا کہ لو بلقیس کی ماں کام ہوگیا۔ سو روپئے ماہانہ اور منافع کا ۲۰ فیصدی۔ یوں سمجھو کہ سو روپئے سیدھے بنک جایا کرینگے اور منافع دو تین سو روپئے سے کم کا ہونے کا نہیں۔ پہلے مہینے ایک ریڈیو سیٹ خریدینگے اور تم جانتی ہو کہ اڈیٹر کے لئے ریڈیو سیٹ کس قدر ضروری ہے۔ دن بھر کے دماغی کوفت کے بعد موسیقی کے نغمے اور پھر دنیا بھر کی خبریں۔ بچوں کا پروگرام بھی ہوتا ہے اور پھر جب میں ریڈیو اسٹیشن پر جاکر تقریر براڈ کاسٹ کیا کرونگا تم گھر بیٹھے سن سکو گی۔ بلقیس جھٹ میری آواز پہچان لیا کریگی اور کہے گی "یہ تو ابا بول رہے ہیں"

•

بلقیس کی ماں نے ایک قہقہہ لگایا۔ اڈیٹر صاحب نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا" دوسرے اور تیسرے مہینے کے منافع سے ایک قالین خریدینگے جو بیٹھک میں پورا آجائے۔ تم جانتی ہو کہ اڈیٹر کی ملاقات کے لئے بڑے بڑے آدمی آتے ہیں اور خالی دری سے رعب نہیں جمتا۔ چوتھے

مہینے کے منافع کی رقم جمع کرتے جائینگے اور چند ماہ کی آمدنی سے ایک موٹر کار خریدینگے۔ لیکن یاد رکھو کہ تمھارے رشتہ داروں نے بار بار آکر موٹر مانگی تو میں انکار کردونگا۔ تمھیں علم نہیں کہ موٹر اسی حالت میں اچھی رہ سکتی ہے جبکہ وہ اپنے ہی استعمال کے لئے مخصوص رکھی جائے۔ لوگ پرائی چیزیں مانگ کرلے جاتے ہیں لیکن ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور یہ ہوا مشین کا کام ذرا بے احتیاطی کی اور مشین بگڑ گئی۔

اچھا تو موٹر کے بعد کیا خریدیں گے؟

بلقیس کی ماں جھنجھلا کر بول اٹھی۔ "آپ نے اپنے ہی کام کی چیزیں گن ڈالیں لیکن کچھ میری فکر ہے؟ کوئی زیور، کوئی کپڑا۔ آپ کے منافع میں کچھ حصہ نہیں۔"

اڈیٹر صاحب بولے "کیوں نہیں جب یہ ساری چیزیں بن جائینگی تو پھر تمام منافع تمھارے ہی لئے ہوگا۔ جو چاہوگی بن جائیگا۔"

بلقیس نے کہا کہ ابا میرے لئے بڑی سی گڑیا بھی لاؤگے؟ اڈیٹر صاحب نے جواب دیا "بچی گڑیا کے لئے پیسے درکار نہیں ایسی چیزیں اخبار کے دفتر میں ریویو کے لئے مفت آجایا کرتی ہیں۔

اگلے دن اڈیٹر صاحب نے بنیا صاحب کے پاس جاکر رضامندی کا اظہار کردیا، معاہدہ لکھا گیا اور اخبار شروع کردیا گیا۔ اڈیٹر صاحب نے

اپنے پرانے رفقائے کار کو بھی ساتھ لے لیا اور اخبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ پہلا مہینہ ختم ہوا تو بنیا صاحب نے چیف اڈیٹر صاحب کو تنخواہ دیکر یہ واضح کر دیا کہ منافع سال کے سال تقسیم ہوا کرے گا۔ اڈیٹر صاحب نے سوچا چلو اکٹھی رقم مل جایا کرے گی اس میں کیا حرج ہے۔

پہلا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے اڈیٹر کو بیلنس شیٹ حساب آمد و خرچ دکھا کر کہا کہ پہلے سال تو کسی کاروبار میں منافع ہوا نہیں کرتا۔ آئندہ چل کر انشاء اللہ وارے نیارے ہونگے۔ اڈیٹر صاحب نے شیٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جس میں منافع کا خانہ خالی تھا اور ہلکی سی آہ بھر کر خاموش رہے۔

دوسرا سال ختم ہوا تو بنیا صاحب نے اڈیٹر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ کمبخت اکاؤنٹنٹ بڑا سست ہے۔ ابھی تک اس نے حساب ہی تیار نہیں کیا بہتر ہو کہ اس کو علیحدہ کر کے کوئی ہوشیار اکاؤنٹنٹ رکھا جائے۔ اڈیٹر صاحب نے اسکی ہاں میں ہاں ملا دی اور چند روز میں دوسرا اکاؤنٹنٹ رکھ لیا گیا۔

اس اکاؤنٹنٹ صاحب نے پرانے اکاؤنٹنٹ کے حساب سمجھنے میں ایک سال اور صرف کر دیا اور جب اڈیٹر صاحب نے مالک سے حساب دیکھنے کا مطالبہ کیا تو مالک نے کہا کہ حساب تیار ہو رہا ہے گھبرایئے نہیں

غرض ایک سال اور گذر گیا اور حساب تیار نہ ہوا۔ اڈیٹر صاحب حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ بہرحال اسی ٹال مٹول میں چار سال گذر گئے اور اڈیٹر صاحب کو منافع کا ایک روپیہ تک وصول نہ ہوا۔ آخر جب انکا اصرار حد سے بڑھ گیا تو بنئیے نے کہا کہ صاحب بات دراصل یہ ہے کہ ان چار سال میں ہمیں نقصان ہی نقصان ہو رہا ہے اگر یقین نہ ہو تو وہ حساب دیکھ لیجئے جو ہم نے انکم ٹیکس والوں کے لئے تیار کیا ہے۔ اڈیٹر صاحب نے جھنجلا کر کہا کہ لائیے وہی دکھائیے۔ لیکن مالک بولا کہ جناب وہ تاحال تیار نہیں۔ اڈیٹر صاحب بہت سٹ پٹائے اور اُنھوں نے دل کڑا کر کے نکتہ چینی شروع کر دی۔

ایڈیٹر :۔ اجی آپ فرما رہے ہیں کہ چار سال میں کوئی منافع نہیں ہوا اور آپ یہ بھی ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ آپ نے اپنی تمام پونجی اخبار میں لگا دی ہے پھر یہ جو آپ نے مکان تعمیر کر لیا ہے اسکی لاگت کہاں سے آئی؟

مالک :۔ مکان بے شک اخبار ہی کی آمدنی سے بنایا گیا ہے لیکن اسے اخبار ہی کا خرچ سمجھئے۔ اگر میرا مکان شاندار ہو گا تو اس سے اخبار ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کلاں کو اخبار پر خرچ کرنے کے لئے مزید روپے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مکان ہے تو جہان ہے۔ ہر جگہ قرض مل سکتا ہے۔ گویا میرا مکان بنانا اخبار ہی پر احسان تو ہے ورنہ میرے رہنے کے لئے کیا پرانا کھنڈر کافی نہ تھا؟

ایڈیٹر :- اور وہ جو اپنے ایک عزیز کو ولائت بھیجنے پر پانچ چھ ہزار روپیہ ضایع کر دیا۔

مالک :- وہ بھی اخبار پر احسان ہے اور اخبار ہی کے مصارف میں شمار ہوتا ہے کیونکہ توقع تو یہ تھی کہ میرا عزیز ولایت سے بڑا افسر بن کر آئے گا اور اسکے ذریعہ اخبار کو سرکاری اشتہارات مل جائینگے۔ یہ قسمت کی بات ہے کہ کامیابی نہ ہوئی ورنہ ارادہ تو نیک تھا۔

اڈیٹر :- اور آپ نے جو موٹر خرید لی ہے؟

مالک :- (قہقہہ لگا کر) آپ بھی بڑے بدگمان واقع ہوئے ہیں۔ اجی جناب یہ دیکھئے میرا جوتا کس قدر بوسیدہ ہو رہا ہے اگر میں موٹر نہ خریدتا تو پیدل چلتے چلتے یہ جوتا بالکل پھٹ جاتا اور آپ جانتے ہیں کہ نیا جوتا خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ یہ اقتصادی مسائل ہیں اگر آپ انھیں سمجھ نہیں سکتے تو آپ کا قصور نہیں تمام اہل قلم کاروباری معاملات میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر :- اور آپ نے ایک عزیز کی شادی میں چار ہزار روپیہ کہاں سے صرف کیا؟

مالک :- اخبار کی آمدنی سے اور وہ اس لئے کہ دلہن مڈل پاس تھی خیال تھا کہ اخبار کا زنانہ کالم لکھا کرے گی۔ کیا یہ اخبار پر احسان نہیں اور یہ روپیہ اخبار کی آمدنی سے خرچ نہیں ہونا چاہیئے تھا؟

اڈیٹر یہ جواب سنکر دم بخود رہ گیا اور لگلے دن اس نے استعفا داخل کردیا اور ساتھ ہی ساتھ نہایت فراخ دلی سے کام لے کر اپنے حقوق و مواجب سے اس نے دست برداری کا پروانہ لکھ دیا۔ گو جان بچی لاکھوں پائے۔ اب یہ اڈیٹر صاحب ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام ۴۲۰ ہو گا۔

مضامین لق لق

وہ آگئیں

جب سے کالجوں میں تعلیم مخلوط ہوئی ہے اکثر ادبی رسائل بھی مخلوط ہو گئے ہیں۔ آپ کوئی رسالہ اٹھا کر اس کی فہرست مضامین پر نظر دوڑائیے اس میں دس نام مرد اہل قلم کے ہونگے تو دو چار خواتین کے اسمائے نازک بھی نظر آئیں گے۔

کالجوں کی مخلوط تعلیم جس "بے تکلفی" کا موجب بنتی ہے مخلوط رسائل بھی اسی قسم کی "رواداری" کا باعث بنتے ہیں۔ زید نے ایک نظم لکھی اور زبیدہ نے ایک افسانہ لکھا۔ دونوں ایک ہی رسالہ میں چھپے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زید اور زبیدہ خود ایک دلچسپ افسانہ بن گئے۔

لاہور میں ایک نامور ادیب کی شادی ایک مشہور ادیبہ سے اسی "مخلوط نویسی" کے باعث ہو چکی ہے۔ ادیبہ نے ایک مضمون لکھا۔ ادیب نے اسکے جواب میں ایک مقالہ لکھا۔ اسی طرح ایک دوسرے پر دو تین وار ہوئے اور دونوں شہید ہو کر رہ گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ بیوی خاوند بن گئے اور وہ رسالہ جن میں انکے مضامین چھپتے تھے اچھا خاصا شادی الجنسی ثابت ہوا۔

ہمارے ارشد مرزا بھی اسی مخلوط نویسی کا شکار ہیں۔ ایک ادبی رسالہ میں انکی اور ایک دہلوی لڑکی مس رفیقہ کی نظمیں چھپتی رہیں اور رفتہ رفتہ دونوں ہم قافیہ مصرعے بن گئے۔ لیکن وزن میں ذرا فرق تھا اسی لئے دونوں نے فعولن معولن کی رٹ لگا کر عرصۂ دراز میں درست کیا۔ مرزا ارشد کی راہ میں یہ مشکل حائل تھی کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ تین چار بچوں کے باپ بھی تھے۔ بہرحال مصرعہ ثانی نے مصرعہ اولی کا یہ

"ایطائے جلی" قبول کرلیا اور یہ طے پایا کہ کیوں نہ دونوں مصرعوں کو ملاکر ایک مکمل اور موزون شعر بنا دیا جائے۔

حسب تجویز ارشد مرزا نے اپنے بھائی کو تار بھیجا جو حسب ذیل تھا:۔

"ALL WELL COME IMMIDIATELY." یعنی ہر طرح خیریت ہے آپ فوراً تشریف لائیے۔ ارشد مرزا نے ہر طرح خیریت کے الفاظ اس لئے جوڑ دیئے تھے کہ کہیں بھائی صاحب پریشان نہ ہو جائیں کہ کیا معاملہ ہے ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں صرف آپ اکیلے آجائیے۔ لیکن گاؤں میں تار کا آنا ایک مصیبت ہوتا ہے۔ ہر چند آصف مرزا لکھے پڑھے آدمی تھے اور تار میں صاف لکھا تھا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ لیکن آپ گھبرا گئے کہ خدا جانے بھائی پر کیا مصیبت آپڑی ہے۔ اسی گھبراہٹ میں آپ نے تار کو ارشد مرزا کے سسرال روانہ کر دیا جہاں ارشد مرزا کے بال بچے گئے ہوئے تھے۔ اور ستم یہ کیا کہ تار کا اردو ترجمہ نہ لکھ بھیجا۔ اب یہ چھوٹا سا گاؤں جس میں ایک پٹواری اور ایک مدرس۔ لڑکا تار لئے پٹواری کے پاس گیا۔ اس نے کہا کہ میں رومن کیرکٹر تو جانتا ہوں اور ان حروف کو پڑھ سکتا ہوں لیکن معنی نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ ایک لفظ کے معنی جانتا ہوں اور وہ "لاہور" یہ تار لاہور سے آیا ہے۔

گاؤں میں تار آجائے تو گھر بھر میں گھبراہٹ پھیل جاتی ہے اور

بعض اوقات کوئی رشتہ دار بیمار ہو یا لڑائی وغیرہ میں گیا ہوا ہو تو تار پڑھائے بغیر رونا پیٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ ارشد مرزا کے گھر والوں میں بڑی پریشانی پھیل رہی تھی کہ مجید مرزا آگئے جو ارشد مرزا کے رشتہ دار تھے اور زمیندارہ بینک کے اڈیٹر تھے۔

لڑکے نے تار دیکر کہا کہ بھائی اس تار کو نہ پٹواری پڑھ سکا، نہ مدرس۔ مجید مرزا بولے "اجی واہ تار کا پڑھنا کوئی آسان کام ہے؟ اسکے لئے قابلیت کی ضرورت ہے کیونکہ اس میں حروف حذف کر کے اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ اور حذف شدہ الفاظ کو جان لینا ایسے ویسوں کا کام نہیں۔ اگر پٹواری اور مدرس تار پڑھنے لگیں تو ہم انٹرنس پاس لوگوں کو کون پوچھے؟"

مجید مرزا نے عینک نکالی اور اپنے آنکھوں پر لگا کر تار کو بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ بلند آواز سے اسلئے کہ انھیں اپنی انگریزی دانی کا لوہا منوانا تھا۔ پہلا لفظ ALL اسکے معنی ہیں سب کے سب یا تمام اسکے آگے WELL یہ فالتو لفظ ہے۔ انگریز اکثر اردو بولتے وقت بھی اسکو استعمال کیا کرتے ہیں مثلاً ویل تمھارا کیا نام ہے۔ اسکے بعد ہے COME IMMEDIATELY اسکے معنی ہیں فوراً چلے آؤ تو سارے تار کا یہ مطلب ہوا کہ سب کے سب چلے آؤ۔

اب ارشد مرزا کی سنیئے۔ وہ اپنے گھر دو تین ہمزاد دوستوں میں

بیٹھے نئی شادی کے متعلق گپ شپ ہانک رہے تھے۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دیکھئے آخر خدا وہ وقت لے ہی آیا کہ میرے دل کی مراد پوری ہونے کو ہے بھائی جان بس آہی رہے ہونگے۔ وہ آئے اور میں انھیں لے کر دہلی پہنچا اور پھر سمجھ لیجئے کہ وہ بھی آگئیں ـــــ میری نئی بیگم صاحبہ

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ارشد مرزا باہر نکلے اور پھر اندر آکر دوستوں سے کہنے لگے۔ اب آپ تشریف لے جائیں وہ آگئیں۔

الطاف :۔ وہ کیسے آگئیں۔ ابھی تک آپ کے بھائی صاحب تو آئے نہیں اور آپ دہلی گئے نہیں۔ وہ کیسے آگئیں۔

ارشد مرزا :۔ ارے وہ آگئیں۔ وہی پرانی بیگم صاحبہ۔

کتے

علم الحیوانات کے پروفیسر سے پوچھا، سلوتریوں سے دریافت کیا خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے ۷ بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے ۶ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی ۱۱ بجے جو ایک کتے کی طبیعت ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلہ میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال و مشرق کی طرف سے ایک

ایک قدر شناس کتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے ہی نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر، آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعہ پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست واقع ہوئے ہیں کہ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے ان کا ذکر ہی جانے دیجیے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لیکر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں ہی کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منھ بند کر کے کھڑا ہو گیا ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور

پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کردی۔ چوکیداری کی چوکیداری، موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پر تان لگائے جاتے ہیں، بے تالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں، گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہتے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے کہ ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیاگرہ سے منھ موڑا ہو۔ شاید آپ اسے تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کبھی کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت ہاتھ میں لاٹھی، چھڑی ضرور رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اگر ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔

شاید اس وقت آپ یہ بھی اندازہ لگا لینگے کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سروں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی

آپ کے ذہن سے اتر جائے گی اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔ بعض اوقات ایسا اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نو مشقی کا عالم بھی ہے اسی لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی ذرا تصور ملاحظہ ہو آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا، یہ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی معقول زاویہ پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھر تھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال ہے کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی بھی نہیں کاٹا اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کے بجائے ہمارا

مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعۂ دعائیہ ہوتا کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا کتا گھانس پیدا ہو لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں اور بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفند یار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لئے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دینگے کہ بھئی بھونک (اگرچہ ایسے وقت میں اسکو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیئے) لیکن یہ کمبخت دوروزہ، سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے گویا اسے روک ہی تو لینگے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہے تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں لیکن ہر کوئی یوں انکی جاں بخشی تھوڑا ہی کر دے گا؟ کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض

یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے انکا ایک پورا خفیہ جتھا باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کرے تو آپ ہی کہئے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے کچھ انکا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات انکی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پہلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابل نفریں رہی ہے۔ اگر انکا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہدے کہ عالی جناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گذار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ اور متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر انکا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں) خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ کتے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہو گا۔ عموماً اسکے جسم پر

تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بار گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بارہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ و مخمور آنکھوں کو کھولا صورت حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز جا کر پرے لیٹ گئے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دم کو تا بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا انھوں نے غیض و غضب کے لہجے میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں آتا؟ ہم سادھو لوگ یہاں

بیٹھتے ہیں۔ بس اس فقیر کی بد دعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے
بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتا ہے۔ بے شمار کتے ٹانگوں سے
لپٹے رہتے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی
ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔ اگر خدا مجھے کچھ عرصہ کے لئے اعلیٰ
قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنون انتقام میرے
پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی
پہنچ جائیں گے۔ ایک شعر ہے ؎

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث
ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے :-

"بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے"

یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند
کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

مضامین پطرس

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے "لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں آپ سحر خیز ہیں ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے"

وہ حضرت بھی (معلوم ہوتا ہے) نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکہ بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے ابھی سے کیا فکر، جاگیں گے تو لاحول پڑھ لینگے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرہ کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی

پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ ہیں کیا میرے آباء و اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی۔

"اچھا! اچھا! ... بہتیرا آوازیں دیتا ہوں .... بہت اچھا! .... جاگ گیا ہوں .... تھینک یو! نوازش ہے!" آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا یہ کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردہ کو جلا رہے ہیں؟ اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہونگے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے؟ تو پیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازہ کی چٹخنی کھول دیتے؟ پیشتر اس سے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اس کا اندازہ تو اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور انکو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا کہ آج پتہ چلائینگے کہ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا

لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟

کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی "لالہ جی! ---------- لالہ جی!"
جواب آیا "ہوں"۔ میں نے کہا آج کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے"؟
کہنے لگے "تو اور کیا تین نبجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین نبجے کا نام سنکر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا "کیا کہا تم نے؟ تین نبجے ہیں؟"

کہنے لگے "تین ---------- تو نہیں ---------- کچھ سات ---------- ساڑھے سات ---------- منٹ اوپر تین ہیں

میں نے کہا ارے کمبخت خدائی فوجدار بدتمیز کہیں کے میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین نبجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین نبجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین نبجے ہم اٹھ کر زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد کو خیرباد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع الشان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے؟ ہمیں اپنے کام سے غرض ہے۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح

اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منھ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک پر نکل گئے۔

شام کو واپس ہوٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا رومان انگیز وقت، ہوا بھی نہایت لطیف تھی، طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی "مسٹر" ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے کہ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر) میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں خیر فرمایئے" بولے ذرا۔۔۔۔۔۔وہ میں۔۔۔۔۔۔ میں ڈسٹرب ہوتا ہوں"

بس صاحب ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مرگئی۔ دل نے کہا "اونا بکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں" صاحب خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آبیٹھے۔ دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ سامنے سرخ، زرد، سبز سبھی کتابوں کا انبار لگا تھا۔

اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے سب کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔ بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیٰحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابونکو سائز کے موافق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانچ سو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح ۳ ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے لیکن کم خوابی کے طبعی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کیا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا لغویات سے ہے۔ البتہ ۵، ۶، ۷ کے قریب نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلد ہی سونا چاہئے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لئے کہہ ہی نہ دیں۔ یوں ہماری قوت ارادی کافی زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا۔ بس ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ

ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ جھنجھلا کے درخواست کی "لالہ جی صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے یعنی جس وقت ۶ بجیں ...." جواب ندارد۔ میں نے پھر کہا جب چھ بج چکے تو .... سنا آپ نے؟ "چپ" لالہ جی"! .... کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا" سن لیا۔ سُن لیا ... چھ بجے جگا دونگا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس ...."

ہم نے کہا" ب، ب، ب، بہت اچھا یہ بات ہے۔"

تو بہ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔ لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدہ کے مطابق دوسرے دن صبح ۶ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ انکا سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا میں نے انکا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس شکل میں اسے قبول کیا گولہ باری بند کر دی۔ اسکے بعد واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور انکے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے آنکھیں کھول دی تھیں پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچہ کی

طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی، پھر کا نہیں پتہ۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ شاید کھانسا کہ خدا جانے خرّاٹا لیا۔ خیر، یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے نہ آپ ماہر ہیں اور نہ میں۔ کیا پتہ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو، اس دن دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کام میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔

جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہہ کی بناء پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا مگر لالہ جی سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کیں اور انکا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ انکی دل شکنی نہ ہو، حد درجہ کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف رہتا ہے جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی یہ خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح

کٹا کرتا۔"

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ پوچھنے لگے "تو میں آپ کو ۶ بجے جگا دیا کرونگا نا۔" میں نے کہا۔ "ہاں! واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" بے شک، شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لئے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر جوڑ دیں، کرسی چارپائی کے قریب سرکا لیا اور کوٹ اور گلوبند کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کن ٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لئے۔ دیا سلائی کو تکیہ کے نیچے ٹٹولا تین دفعہ آیت الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔ صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے انکو "گڈ مارننگ" کیا اور نہایت بیدارانہ لہجہ میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ ہم نے اپنی ہمت اور اُلو العزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا دل بھیا صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔ دل نے کہا اور کیا؟ تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں ہم نے کہا سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ

ہونگے جو دنیا ومافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہونگے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔

بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں۔ ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے ------ خوب ------ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اسکی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز شروع کر دینگے آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں نہ خدا کا ڈر ہے نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لینگے۔ اکبر بیچارا یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی ---------- (لحاف کانوں پر سرک آیا) ------ تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں ------- بہت ہی پہلے ------ یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے۔ ------ کیا بات ہے! خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج ۷ بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے ---------

(لحاف سر پر) ------ بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام

قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

---------- آنکھیں بند) ---------- نواب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹہ تو مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شکسپیئر یا ورڈسورتھ؟ میں جانوں شکسپیئر بہتر ہوگا۔ اسکی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دیکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں.... ورڈسورتھ پڑھیں۔ اسکے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل و دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہونگے ---------- لیکن شکسپیئر ---------- نہیں ورڈسورتھ ہی ٹھیک رہے گا ---------- شکسپیئر ---------- ہملیٹ ---------- لیکن ورڈسورتھ ---------- لیڈی میکبتھ ---------- دیوانگی ---------- سبزہ زار ---------- سنجر سنجر ---------- باد بہاری ---------- صبیا ہوس ---------- کشمیر ---------- میں آفت کا پرکالا ہوں ----------" یہ معمہ اب فلسفہ مابعد الطبعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈسورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے۔ کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے۔ "مسٹر" صبح میں نے پھر آواز دی تھی۔ آپ نے آواز نہ دی۔" میں نے

زور کا قہقہہ لگا کر کہا" اوہ اوہ، لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں پہلے ہی سے جاگ رہا تھا" بولے" وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں .... اس کے بعد........ کوئی سات بجے کے قریب آپ سے تاریخ پوچھی تھی آپ بولے ہی نہیں ....."
ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے انکو دیکھا گویا وہ پاگل ہو گئے تھے اور پھر متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس عمق میں رہے پھر یکایک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا" ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں اس وقت .... اے .... اے نماز پڑھ رہا تھا
لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیئے اور ہم زہد و اتقا کی مسکینی میں سر نیچا کئے کمرے میں چلے آئے۔ اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ۱، ۶ بجے، جاگنا ۲، ۱۰ بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمارا فرق ناز محو بالش کم خواب، اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہو، گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو، آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت: "سانوری صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے نصیب یہ ہے کہ پہلے "مسٹر! مسٹر!" کی آواز اور دروازے کی دنا دن سلما نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشہ ریشہ میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑیوں کی گڑگڑانے .... پھر دیگچیوں کے الٹ جانے، دروازے کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا قبیل الدیہ ٹھمریاں ہے۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سر تال کی کس قدر گنجائش ہے۔

جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں
موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے

مضامین پطرس

مشینوں کی موت

ایک دو روز پہلے خفیف سا چرچا تھا کہ سارے ہندوستان میں بجلی کے کارخانے خراب ہو رہے ہیں۔ برقی طاقت پوری طرح کام نہیں کرتی۔ آخر جمعہ کو یہ بات اخباروں میں چھپ گئی کہ ملک بھر میں کوئی نرالا برقی تلاطم ہے کہ برقی رو پیدا ہوتی ہے مگر کام نہیں کرتی۔ ہفتہ کے کسی شخص کو کوئی تار کہیں سے نہ آیا۔ سرکاری بے تار کے برقی پیغام البتہ موصول ہو رہے تھے مگر انکا راز کسی پر نہ کھلا۔ اسی دن بہشت سے ہوائی جہاز کسی غیر معلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے اور ریلوں میں بہت سی انگریزی فوجیں بھی کسی طرف نکل گئیں۔

اتوار کو لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا گو دلکلتہ جیسے بڑے شہر میں تاروں کا نہ آنا سخت اضطراب انگیز ضرور تھا۔ صبح پیر کو ایک بے تار برقی پیغام آیا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ایک روز تک سارے ملک کی مشینیں خراب ہو جائینگی، اور اس پیغام کو آخری پیغام سمجھنا۔

دسلکتے ہیں پیر کا دن عجب شورش میں گذرا۔ جن دفاتر، دکانوں اور کارخانوں میں انگریز افسر ہوتے وہاں کوئی انگریز نہ تھا۔ کلرک۔ چپراسی مزدور سب بلا کام کئے واپس آ گئے۔ اسکے بعد کی ڈائری حسب ذیل ہے۔

(دیپیر ۵ بجے شام)

سارے شہر میں عجب شاندار جلسے ہوئے۔ بھارت ماتا کی از سر نو تابندگی کس قدر شان دار ہے۔

سری جت متر چیندر داس۔ پنڈت چھتری مہاراشٹر۔ راجہ نرمل بھگت نے وہ تقریریں کیں کہ ساری عمر میں ان لوگوں نے پبلک کے دل میں اپنی اس قدر محبت پیدا نہ کی ہوگی۔ جو آج کی تقریروں سے کی۔ داس صاحب نے کہا کہ پرماتما کرے کہ یہ جھوٹ کہ مشینیں بیکار ہو جائینگی سچ ہو جائے۔ کیا سری حضور رامچندر جی موٹروں میں سوار ہوتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ انکی روحانی شکتی البتہ ضرور اس پایہ کی تھی کہ وہ جہاں چاہتے بغیر مشینوں کی مدد کے جاسکتے تھے مگر اُنھوں نے اپنے پیارے پوتر ملک کے لئے مشینوں کا رائج ہونا پسند نہ کیا۔ جو لوگ ہندوستان اور لنکا کے درمیان پل بنا سکتے تھے کیا ان کے لئے ریلیں اور موٹریں ناممکن تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے مقدس بزرگ ہمیشہ مادی ترقی کو حقارت سے دیکھتے رہے ہیں۔ اور کیوں نہ دیکھتے؟۔ کہاں ہیں آج وہ مشینوں کے شیدائی اور ان کی لاٹھی باز پولیس؟ ہمارے لئے وہ دن مبارک ہوگا کہ

مشینیں بھی جائیں اور وہ بھی جائیں۔ اس تقریر پر پبلک کی طرف سے برابر پندرہ منٹ خوشی کے نعرے لگتے رہے اور تین دفعہ بندے ماترم کا گیت گایا گیا۔ اس کے بعد پنڈت چھتری صاحب کی تقریر شروع ہوئی پبلک کا خیال تھا کہ داس صاحب کی تقریر کے بعد چھتری صاحب کی تقریر کیا لطف دیگی مگر انھوں نے ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ فرمانے لگے کہ میرا وقت، میرا دھرم بھارت ماتا کے غریب سپوتوں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ غریب آدمیوں کو پہلے کون سے تار آتے تھے؟ اب نہ آئینگے تو کیا ہوگا؟ غریب آدمی پہلے کہاں موٹروں میں بیٹھتے تھے ان کے گھروں میں کون سے بجلی کے لمپ جلتے تھے؟ میں اُن کا ہوں وہ میرے ہیں۔ ہماری بلا سے اگر بجلی کے کارخانے بند ہیں تو ہونے دو بھارت ماتا میں کس چیز کا کال ہے؟۔ ہمارے ہاتھ زمین کھودنے کے، ہماری ننگی پیٹھیں بوجھ ڈھونے کی عادی ہیں۔ فکر وہ کریں جن کا کچھ جاتا ہو۔ بھارت ماتا کے لئے وہ دن مبارک ہے کہ غریب اور امیر میں قدرتی مساوات ہو۔ وہ مساوات جس کے لئے ہمارے رشی کوشش کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں گوتم نے بادشاہی چھوڑ دی۔ کیا ہمارا ملک مشینیں نہیں چھوڑ سکتا؟ ہماری رائے یہ ہے کہ مشینیں اگر چلیں بھی تو مت چلاؤ۔ اس تقریر میں دس منٹ بڑے زور شور کی واہ واہ ہوئی۔ اور تین دفعہ بھارت ماتا کا گیت گایا گیا۔ ان کے بعد

نرمل بھگت نے تو عجیب سماں پیدا کیا۔ فرمانے لگے کہ جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ اور یورپ دونوں متفق تھے کہ مشینوں کی پیدا کردہ تہذیب مہلک ہے۔ مشینوں نے انسانوں کو انسان سے بدل کر بے جان پرزے کر دیا تھا۔ موچی، بڑھئی، لوہار کو جو اپنے ہنر کا لطف پہلے تھا وہ مشینوں نے مفقود کر دیا۔ مشینوں نے ٹھیکے دار پیدا کیے مگر ہنرمند دستکار پیدا نہ کیے۔ یہ پرماتما کی خاص رحمت ہے کہ اب ہر شخص کو اپنے کام میں طبعی جدت کے اظہار کا موقع ملے گا۔

ان تقریروں کے ختم ہونے کے بعد شہر میں جا بجا چھوٹے چھوٹے جلسے ہوئے اور اس شام تک دلکتہ اس قدر خوش تھا کہ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی شہر ایسا خوش ہوا ہو۔

(دہپیر ۹ بجے رات) :۔ کوئی آدمی خبر لایا ہے کہ ریلیں سب بند ہو گئیں اس نئی خبر سے شہر میں تلاطم ہے۔

(دہپیر ۱۰ بجے رات) :۔ گھوڑے گاڑیوں کے پہیے نہیں چلتے۔ عوام میں پریشانی زیادہ ہے۔ پولیس جان کے خوف سے کہیں چھپ گئی ہے۔

(دہپیر ۱۱ بجے رات) :۔ ابھی ابھی مشہور ہوا ہے کہ پستولوں میں گولیاں نہیں چلتیں۔ کئی آدمی میرے سامنے پستول دیوار پر چلا چکے ہیں۔ آواز آتی ہے مگر گولی میں زور نہیں۔ سارا شہر جاگ رہا ہے مگر

کوئی شخص تقریر کرنے یا سننے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ ڈر کے مارے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے بازاروں سے خوف آتا ہے۔ گھر جاکر سوتا ہوں۔

(منگل صبح ۷ بجے):۔ تمام رات دروازے بند کئے پڑا رہا مگر نیند نہ آئی۔ اب باہر نکلا ہوں تو سنتا ہوں کہ شہر میں کہرام ہے۔ آٹا پیسنے کی مشینیں بند ہیں۔ آدھا شہر چکیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

(منگل صبح ساڑھے سات بجے):۔ چکّی کا پاٹ نہیں پھرتا، چرخہ نہیں چلتا۔ شہر میں لوگ سخت خوف زدہ ہیں

(منگل ۹ بجے صبح):۔ آٹھ دس بنئے قتل ہو چکے ہیں۔ سب بنئے گھروں میں چھپ گئے ہیں۔ اور روپیہ اور نوٹ انھوں نے چھپا دیئے ہیں۔ اصل بات یہ ہوئی کہ صبح ہی صبح چند ہوشیار بنئے نوٹ لے کر گھر گھر پھرے اور دس کے نوٹ کے بدلے نو نو نوٹ لیتے رہے۔ سب غریب آدمیوں کو یہ پتہ چلا کہ بنئے لوگ اس لئے یہ چال کھیلے ہیں کہ ٹکسال بند ہو گئی ہو گی۔ اور روپئے اب نہ بنینگے تو وہ نوٹ واپس لے کر گئے مگر بنیوں نے روپیہ واپس دینے سے انکار کیا اس پر تکرار ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی اور بلوہ ہو گیا۔ اسی وقت یہ بھی مشہور ہو گیا کہ گاؤں میں بھی بنیوں نے یہی کیا ہے

اور وہاں بھی کاشتکار قتل مقاتلے پر اُتر آئے ہیں۔

(منگل ۱۲ بجے دوپہر) :- شہر میں معززین نے ایک حکومت کمیٹی قائم کی ہے تمام دیاسلائیوں کے بکس اس کمیٹی کے حکم سے جمع کئے جارہے ہیں۔ جن لوگوں کو چقماق سے آگ بنانے کا علم ہے ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ سارے شہر میں سخت خوف ہے کہ اگر دیاسلائیاں ختم ہوگئیں تو اس سردی کے موسم میں غضب ہو جائیگا۔

(منگل دو بجے بعد دوپہر) :- آدھا شہر بھوکا ہے۔ لوگ بازاروں میں روٹی فروخت نہیں کرتے اور دکانیں سب بند ہیں۔ حکومت کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ کل تک سب کے کھانے کا انتظام کمیٹی کی طرف سے ہوگا۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک چھٹانک بھنے گیہوں اور ایک چھٹانک چنے ملیں گے۔

(منگل ۴ بجے بعد دوپہر) :- ملحقہ بڑے شہروں اور دیہاتوں سے سخت وحشت ناک خبریں آئی ہیں۔ شہر کے دروازوں پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ ہر شخص لاٹھی لئے پھر رہا ہے۔

(منگل ۵ بجے شام) غضب ہوگیا۔ پانی کے نل تو بند تھے ہی اب کنوؤں پر چرخیاں نہیں چلتیں۔ ڈول سے پانی کھینچنا پڑتا ہے حکومت کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں ہر شخص صرف ایک ڈول پانی نکالے۔ مختلف کنوئیں مختلف محلوں میں

تقسیم کئے گئے ہیں۔ پانی پر بہت سی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔

(منگل ۶ بجے شام):۔ بازاروں میں روشنی نہیں لالٹینوں میں تیل نہیں جلتا۔ بتی اوپچی نہیں ہوتی۔ شہر کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ بھوکے آدمی .... کے گھر میں گھس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پورا حصہ مکان کا غلّے اور دیا سلائی سے بھرا ہے۔ اس پر لوگوں کو بہت غصّہ آیا اور وہ سب مال نکال کر لے گئے .... کو حکومت کمیٹی سے الگ کیا گیا ہے۔ ہر شخص سخت خائف ہے۔

(منگل ۷ بجے شام):۔ رات بے انتہا نقب زنی کی وارداتیں ہوئی ہیں۔ بہت سے بینک لٹے، بہت سے دفتر، کئی جوہریوں کی دکانیں۔ حکومت کمیٹی نے چند آدمیوں کو جو موقع پر پکڑے گئے تھے بازار میں الٹا لٹکا دیا ہے کہ لوگ خوف کے مارے چوریاں بند کر دیں۔

(بدھ ۹ بجے صبح):۔ سخت وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ دیہاتی، لوگ کو لوٹنے آ رہے ہیں۔ جہلا میں یہ مشہور ہے کہ کسی فقیر کی بددعا سے یہ قہر نازل ہوا۔ جن لوگوں نے کہا تھا کہ مشینوں کا بند ہونا بھارت ماتا کے لئے مبارک ہوگا، وہ خوف کے مارے چھپ گئے۔ میرے پاس والے گھر میں بچہ رو رہا ہے کہ اماں

میرا گیند نہیں لڑھکتا۔ ایک نوجوان سائنس داں کو لوگوں نے بازار میں بہت مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ صرف یہ ہوا کہ کسی برقی تلاطم کی وجہ سے کرۂ زمین کی حرکت بند ہوگئی۔ نہ گاڑی کا پہیا، نہ کسی مشین کا گول پرزہ، نہ گیند کوئی چیز چکر نہیں لگا سکتی۔ ابھی بیچارے نے بات بھی ختم نہ کی تھی کہ چند شہریوں نے اُسے پکڑ کر کہا۔ تھم چکر کہیں کا؛ خدا کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ لا تجھے تو چکر دیں۔ یہ کہکر ان بدمعاشوں نے اسے پیٹتے پیٹتے بے دم کر دیا۔

(بدھ ۵ بجے شام) سارے شہر کی عورتیں اور مرد جمع ہوکر اپنے اپنے دھرم کے مطابق دعا مانگنے گئے ہیں کہ یہ قہر دور ہو۔

(بدھ ۷ بجے شام):- دعا کے جلسے ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک مذہب والوں نے دوسرے مذہب والوں کی کسی طرح توہین کر دی۔ شہر میں اس وقت خانہ جنگی زوروں پر ہے۔ کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہیں۔

(بدھ رات ۱۰ بجے) دیہاتی لوگ شہر میں آگھسے مگر اس سے خانہ جنگی ختم ہوگئی ہے۔ دیہاتی لوگوں نے شہر میں، بازاروں میں پہرے بٹھا دیے ہیں۔ سب اپنے گھروں میں خوف سے بند بیٹھے ہیں۔ اکثر بھوکے پیاسے ہیں۔ باہر سے دودھ جو آتا تھا وہ کل سے نہیں آیا

ہزاروں بچے بلبلا رہے ہیں۔ شہر کی جو چند گائیں ہیں ان کا دودھ، ایک حصّہ دودھ، آٹھ حصّے پانی ملا کر صرف ایک سال سے چھوٹے بچوں کے لئے فروخت ہو رہا ہے۔ میرے ہمسایے میں ایک ماں کی ایک ہی بچی ہے جو بیمار ہے۔ صرف ڈیڑھ سال کی ہے اُسے کل سے دودھ نہیں ملا۔ وہ سخت بری طرح رو رہی ہے ماں رو رو کر دعا کر رہی ہے کہ پرماتما اس بچی کے اچھا ہونے تک مجھے دودھ عطا کر دے۔ کہہ رہی ہے "پرماتما اور کچھ نہیں مانگتی مجھے اس بچی کی گائے بنا دے۔ اس معصوم کو بھوکا پیاسا نہ مرنے دے"۔

(اتوار بعد دوپہر): جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کے حالات قابل تحریر نہیں۔ میں زندہ تھا مگر بھوکا پیاسا نیم پاگل۔ خوف کے مارے اس سردی میں ایک پرانے تہ خانہ میں چھپا رہا۔ شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ آج صبح اس تہ خانے سے نیم جاں، نیم پاگل، پیاس سے عاجز ہو کر باہر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ بازار میں انگریزی فوج کھڑی ہے اور یہ منادی ہو رہی ہے کہ

سب ٹھیک ہے کوئی خوف نہ کرو

(پیر ۱۰ بجے صبح) کل بعد دوپہر پانی پیا تو بے ہوش ہو گیا۔

آج گذشتہ ہفتہ کی تمام مصائب کی وجہ معلوم ہوئی۔ مریخ ستارے کے سائنس داں اس زمین سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے وہ برقی رَو اپنے وطن سے ہمارے کرۂ ارض کی طرف بھیجی جس سے ہر قسم کے چکّر کی حرکت بند ہو جائے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اس قسم کی برقی رو نہ بھیجتے تو وہ رو کبھی زمین تک نہ پہنچتی۔ اول تو وہ فضا میں منتشر ہو جاتی اور جو یہاں پہنچتی تو وہ زمین اور زمین کی مشینوں کی حرکت سے کافی کارآمد نہ ہوتی۔ یورپین سائنس دانوں کو چونکہ اس کا خیال تھا۔ انھوں نے اپنی فوج اور حکومت کو مطلع کر دیا اور یہ لوگ اتنے دن اپنے جہازوں میں سمندر پر رہے۔ مریخ کی برقی رو کا اثر سمندر پر بہت کم تھا۔

[مضامین فلک پیما]

نئی دکان

انسان بیمار ہو تو قسم ہا قسم کے غیر ضروری سوالوں پر ضرورت
سے زیادہ غور کر لیتا ہے مثلاً اسی سوال پر کہ زندگی کیا ہے؟
تندرست آدمی کو غور کی فرصت کہاں؟ وہ تو عملی طور پر زندہ
جواب یہ دیتا ہے کہ اگر انسان اڈیٹر ہو تو زندگی یہ ہے کہ ہر روز کسی
بھائی اڈیٹر یا کم از کم گورمنٹ کو دو چار گرما گرم سنا دیں۔ کسی
خودسر لیڈر کی مرمت کر دیں۔ اپنی من بھاتی روحانی غذا کے دوہرے
گا دیں اور جو اس رائے سے متفق نہ ہوں انھیں زندہ درگور کر دیں۔
اگر انسان تاجر ہو تو زندگی یہ ہے کہ سستا خریدیں مہنگا بیچیں
اور بچت سے کڑوں پر کڑے اور محلوں پر محل بنواتے چلے جائیں
لوگوں سے بھی سنیں، خود بھی کہیں کہ محنت کا پھل ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔
اگر انسان معلّم ہو تو زندگی یہ ہے کہ کوڑ مغز کا ہاتھ اور
ماسٹر صاحب کا بید۔ آئے دن اور ہر سال۔ یہاں تک کہ کتابیں دھڑا دھڑ

بکیں۔ امتحان کے پرچے دیکھنے کی فیس آئے۔ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم تعریف کریں اور صوبے بھر میں نام ہو۔

گویا تندرستی کو اس سوال سے کہ زندگی کیا ہے کوئی خاص حکیمانہ دلچسپی نہیں یا یوں کہئے کہ حکمت (فلسفہ) بیماریوں کا مشغلہ ہے مگر حال ہی میں علم النفسیات کے ایک ماہر کی کتاب نظر سے گذری ہے جو اس زریں اصول کو ٹھکراتی نظر آتی ہے۔ یہ ماہر سچے معنوں میں شفاء الملک ہیں۔ بیمار جسموں کا علاج خیالات کی مرہم پٹی سے کرتے ہیں اور بے انتہا کامیاب ہیں۔ یوں سمجھیے کہ پوشیدہ اور فراموش شدہ حسیات کے دھوبی ہیں۔ پہلے چھپے انسانی احساسات کو سرنگ لگا کر باہر نکال لاتے ہیں پھر ان کو جمع شدہ کثافت و غلاظت سے الگ کرتے ہیں اور جب یہ نکھرے ہوئے احساسات اپنا عکس خود دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مریض سے کہتے ہیں کہ چلو چھٹی اور واقعی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرز عمل پر تو اعتراض نہیں مگر جب ان ماہر صاحب کے علاج کے فلسفے پر غور کرتا ہوں (آج کل طبیعت کچھ نادرست ہے) تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا نکلی اور محض اردو خواں ابھی تک اپنی پرانی ادھیڑ بن میں ہیں مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر ان ماہر صاحب کا صرف ایک

نظریہ پیش کرتا ہوں۔ اگلے وقتوں کے لوگ (یعنی ہم محض اردو خواں) تو یہ سوچا کرتے تھے کہ کیا جھوٹ بولنا کبھی جائز ہو سکتا ہے؟ مگر ان ماہر صاحب کا خیال اس کے لگ بھگ ہے کہ بعض خاص حالات میں چنداں قابل اعتراض نہیں۔ راستی موجب رضائے خدا است کا بتنگ اس نفاست سے انھوں نے کاٹا کہ واہ واہ واہ کرتے بیچارے سعدی کے دروغ مصلحت آمیز کا گلا بیٹھ گیا ہے۔

حضرت ماہر صاحب فرماتے ہیں کہ بقا بعد از مرگ (روح انسانی کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ) کو یوں تو کون باور کریگا مگر آج کل یورپ میں جو سینکڑوں پیران نود سالہ وصد سالہ موجود ہیں وہ موت کے انتظار میں کیا سوچتے ہیں؟ کیا ان کے لئے بہترین خوش رکھنے والا طریقہ نہیں کہ وہ یہ باور کرلیں کہ صرف جسم ہی مرے گا، روح کو ہمیشہ بقا رہے گی۔ اور اگر یہ بہتر طریقہ ہے تو پھر کیوں اس پر اعتراض نہ کیا جائے کہ یہ اعتقاد نہایت لابدی ہے؟ دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب کا ارشاد گویا یہ ہے کہ مذاہب کا پہلا اور آخری تمام تر مقصد یہ ہے کہ وہ دل خوش کن فریبوں کا خوبصورت مجموعہ ہوں لاحول ولا قوۃ۔ اگر حضرت اسی پر اکتفا کرتے تو خیر گذر تی مگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شباب کے مذہب سے ایام پختہ کاری کا مذہب قطعی الگ ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنی عمر کے

مختلف مدارج کے لئے۔ مذاہب کا فرض ہے کہ مختلف پیرایوں میں فریب کاری کی خدمت سرانجام دیں۔ ان حضرت کی کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے شبہہ ہونے لگا کہ یورپ میں مذاہب کی کوئی نئی دکان تو کھلنے والی نہیں کہ ہر موسم، ہر قد، ہر رنگ، ہر قابلیت اور ہر عمر کے لئے مذہب کا تن زیب وہاں مہیا کر دیں۔ اگر یہ دکان چل نکلی تو پھر فیشن کی ستم کاریاں غضب ڈھائینگی۔

کاش ہندوستان کوئی ایسا سودیشی سورما (مہاتما کی دکان بند ہونے والی) پیدا کر دے جو یورپ کی اس نئی دکان کے کھلنے سے پہلے ہی ہندوستان میں کاروبار چلا کر دکھلا دے۔ ہر قسم کے مذہبی تفرقے مٹ جائیں۔ مختلف مذاہب والے لڑتے اسی لئے ہیں کہ ہر شخص بجائے خود سچے دل سے یقین رکھتا ہے کہ میرا رہنما راستی کا واحد ٹھیکہ دار تھا اور جو مجھ سے متفق نہیں انکا راستہ غلط ہے مگر یہ صاحب تو فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے اسکے حسب حال دروغ راستی نما کی ضرورت ہی گویا انا الحق کی بجائے یہ نئی معرفت نکلنے والی ہے کہ

انا الکذب

اور ہر شخص دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم سب جاتم ہیں۔ اخوت النسانی کا یہ نیا سبق یورپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم پنجابی اردو خوانوں کے لئے تو اپنے پرائے پیرا اچھے ہیں کہ کھاتے ہیں مگر کم از کم

کبھی کبھار یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ۔ یہ کیا یورپ کا تمسخر ہے کہ خود فریبی کا لطف اٹھاؤ؟۔ حضرت اکبر تو فرما گئے کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں مگر میں تو درگاہ الٰہی میں دن رات یہ دعا کرتا ہوں کہ یورپین دماغ میں یورپین بم پھٹیں۔ کہاں ہم غریب صدق دل سے پارسائی پر مرنے والے اور کہاں یہ خراباتی کہ جامۂ پارسائی کو بازاری مگر ضروری پہناوا بیان کرتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ علم کی اور عالم کی سچے دل سے عزّت کرتے تھے مگر یورپ والے علم کو اور عالم کو جسمانی خوشی کا غلام تصور کرتے ہیں اور وہاں کے عالم خود اس نئی طرز کے موٴیّد ہیں لعنت بہ کار شیطاں!

مکرر۔ مگر کہیں یہ نہ ہو کہ یورپ والے ہی سچے ہوں واللہ اعلم بالصواب۔

سہ کرر۔ کچھ بھی ہو مگر یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ کاش یہ نئی دکان سب سے پہلے ہندوستان میں ہی جاری ہو۔ غیرت ہندی اور حب الوطنی کا زبردست تقاضا ہے کہ بجائے اسکے کہ آواگون موت کے بعد ہو۔ یہ صورت ہو جائے کہ اس کی زندگی کے اندر ہی اندر

جو آج بنگالی اور برہمو ہے وہ کل سکھ اور پنجابی ہو۔ جو کل پارسی اور بمبئی کا سیٹھ تھا وہ آج سرحد کا پٹھان ہو۔ یہ تغیر و تبدل اس سرعت سے ہو کہ میاں بیوی کو اور بچے ماں باپ کو نہ پہچانیں۔ انگریز زبانیں سیکھتے سیکھتے عاجز آجائیں اور گھبرا کر یہاں سے چل نکلیں۔ کیا ہی لطف رہے کہ جو ایک دن پنڈت ہو وہ دوسرے دن چمار، اور تیسرے دن والی ریاست کے روپ میں نظر آئے۔ پھر تو کسی کو شبہہ کی گنجائش نہ رہے کہ ہندوستانی اصل میں سب ایک ہیں۔

مضامین فلک پیما

غسلیات

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانہ بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانہ کی یادگار ہے جبکہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے، اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈے ہونے کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اس آبی زمانہ کے وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جسکے نام سے ڈاروِن کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانہ میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میر

بہت سے احباب جو اس قابل نفرین رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آچکے ہیں اور کچھ بہت پر امید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے اللہ ان بدستور ان میں نہاتے، اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں ہر دو ہزار افراد کے لئے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے چنانچہ محکمۂ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسلخانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتہ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا۔ اور پھر میرے پاس تو پر امید رہنے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں انھیں بالتفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاہی خلفشار کے زمانے میں لوگوں کو غسل سے

وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہردو مقبول، عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جارہی ہے انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جارہی ہے اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے۔ ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربیئے کا دوسرے پوربیئے سے کہنا: "ارے یار! تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔" ذرا خیال کیجئے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے۔ خودداری، بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی یہ بتا دے کہ وہ دن کے کئے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر:۔

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟۔ پوربیا۔ بنیا۔ میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر۔

صبح ۶ بجے۔ ڈاکیہ۔ دفتر کا بابو۔ پولیس کا سپاہی۔

۸ بجے۔ پروفیسر۔ کالج کا لڑکا۔

دس بجے۔ صاحب بہادر۔ لیڈر

بارہ بجے۔ منسٹر۔ مجسٹریٹ۔ رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائینگے آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے تو اب صرف دو منٹ پر آجائینگے۔ اگر پہلے سارے جسم کو بار بار پانی میں ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں جبکہ لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کرینگے، اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کرینگے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" اور یقیناً جس طرح ہندوستان کو سوراج حاصل ہو گا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جبکہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو سینیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منھ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کرینگے۔ اور نہایت غرور سے کہا کرینگے "آج تو ہم نے غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منھ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانہ کو، آج کل

لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتے میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں۔ اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ، واہ، اس نہانے میں بھی کیا مزہ ہوگا۔"

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں، بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں۔ اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھر آتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہئے نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی

رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اسکے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ اکثر وہ ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح کو اٹھکر اپنے پھولس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے۔ جس نے انکو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے کاغذی جسم پر ہاتھ پھیرتا رہتا اور سوچتا کہ یا الٰہی اس جسد خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں۔ موٹی، بانجھ اور بدصورت بیویاں۔ وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچکر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے اگر "وہ" مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا؟

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی۔ بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں

بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہیں نہانے دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کرینگے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہیئے چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے، دریا پر گئی، اور نہا کر گھر واپس لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے۔ اسکے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی اور اسکے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ یہ میری بیوی ہے۔ نہیں یہ میری بیوی بنے گی۔ اسے میں لونگا۔ اسے میں لونگا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپیا تک پہونچی۔ طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جان بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں۔ اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں

بلند ہوتی ہیں "اسے میں نہ دونگا۔ اسے میں نہ دونگا۔ یہ میری ہے یہ میری ہے!"

نتیجہ:۔ نہانا اخلاقی جرم ہے

آخر میں آپ استفسار کرینگے تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے اسے ملیا میٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اسکے خلاف پرزور پروپگنڈہ کیا جانا چاہیئے۔ مگر صاحب یہ توسب وقتی، رسمی، ہنگامی ہا نئیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۱۴۴۔ الف میں یہ ایزاد کئے جائیں:۔

ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔

جو شخص غریب بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائیگا اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "بابو جی غسل خانے میں پانی دیر سے

دھرا ہے آپ جلدی نہا لیں ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں قلم چھوڑ کر میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا ؎

جو نہاؤ گے تو مرٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہوائی قلعے

رونا

مثل مشہور ہے کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا کہنے کو تو سچ ہے لیکن جہاں تک اسے کر دکھانے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں بالکل پھسڈی واقع ہوئے ہیں۔ "ہم" سے میری مراد ساری انسانی برادری ہے۔ کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور کیا ہے کہ

جوں جوں ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں گانا تو خیر کبھی کبھی سُن لیتے ہیں۔ اگر کوئی قریب نہ ہو تو گا بھی لیتے ہیں، جیسے کبھی کبھی نہانے کے کمرے میں یا کسی سنسان سڑک پر چلتے ہوئے۔ لیکن رونا جو ہمارے بچپن کا ایک مرغوب و محبوب مشغلہ ہے اب پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بڑے ہو کر اسے قریباً قریباً بھلا دیا جاتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے ایک دوست ذکر کر رہے تھے کہ آخری بار جب وہ روئے تھے اس موقعہ کو اب قریباً دو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دن میرے ایک قریبی دوست کی موت ہوئی تھی۔ پھر میری طرف دیکھ کر ایک آہ بھر کر کہنے لگے۔ آج کل نہ تو کوئی عزیز دوست مرتا ہے نہ ہی کسی رشتہ دار کی موت ہوتی ہے تاکہ چار آنسو بہا کر جی ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کبھی کبھی یونہی رونے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر سوچتا ہوں لوگ کیا کہینگے۔

رونا کیوں اس قدر ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا ہے؟ آخر اسکی وجہ کیا ہے کہ ہر شریف انسان اسے برا سمجھتا ہے اور بزدلی کی نشانی۔ درحالیکہ رونا ایک فطری فعل ہے بلکہ انسان کا سب سے پہلا فطری فعل اور اکثر حالتوں میں سب سے آخری بھی۔ گانا بیشک ایک اچھی چیز ہے لیکن رونا اس سے ہزار درجہ بہتر۔ بچپن میں ہم گاتے کم تھے اور روتے بہت۔ بچپن میں جب ہم روتے تھے تو اکثر بار بار پچکارنے پر بھی چپ نہ ہوتے تھے بلکہ کئی لوگ

پچکارتے بھی نہ تھے۔ وہ کہتے تھے اچھا ہے خوب روؤ۔ رونا بچوں کے لئے مفید ہے۔ لیکن اب عجیب حالت ہے اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہوکر آب دیدہ ہوجائے تو لوگ اُسے بزدل، زنانہ مزاج پست ہمت کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسی بیچارے کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑیں یا ایک آدھ ہلکی سی چیخ بھی منھ سے نکل پڑے تو اسے ہیجڑا کہہ دینے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا! آخر بات کیا ہے۔ ایک چیز جو بچوں کے لئے مفید ہے ان آدمیوں کے لئے جو اب بچے نہیں ہیں کیسے مضر ثابت ہوسکتی ہے۔

حکیم لوگ بتاتے ہیں کہ رونا بچوں کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے چھاتی کھلتی ہے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ کر آنکھ کی پتلیوں کو صاف کرتے ہیں۔ ناک کے نتھنوں سے ریشہ جاری ہوکر باقاعدہ تنفس جاری ہوتا ہے رونے سے عضلات اور ریشوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ الغرض رونا، کشتی لڑنے کے بعد دوسری بہترین ورزش ہے۔ پھر اس سے محض بچے ہی کیوں فائدہ اٹھائیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں چوڑی چھاتیوں اور مضبوط پھیپھڑوں کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اگر بچپن میں ان چیزوں کی ضرورت تھی تو اب جوانی یا بڑھاپے میں تو اسکی ضرورت

بہت شدید ہو جاتی ہے۔ غالباً بچوں کے دن رات رونے کی وجہ ہی سے تپ دق نہیں ہوتا۔ اگر ہم لوگ بھی دن میں دو تین گھنٹے رو لیا کریں تو جہاں پھیپھڑے مضبوط ہوں وہاں نہ دمہ ہو نہ زکام۔ آنکھوں کی بینائی بھی ٹھیک رہے۔ کتنے بچے چشمہ لگاتے ہیں اور کون سا بوڑھا یا جوان ہے جو چشمہ کی حاجت محسوس نہیں کرتا۔ لوگ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے سدھ مکر دھوج، گولڈ ٹیلیز، ماء اللحم، شربت فولاد استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان قیمتی دواؤں کے بجائے وہ قدرت کے بیش ترین اصول برتیں اور دن میں صرف ایک آدھ گھنٹہ جی بھر کر رو لیا کریں تو جہاں جسم طاقت ور رہے وہاں دن بھر دل میں امن و سکون بھی رہے۔ اور وہ انتشار جو اس بیسویں صدی میں ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے خود بخود مٹ جائے۔

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ رونا صحت کے لئے کس قدر مفید ہے رونا جسم کی غذا ہے۔ نہ صرف جسم کی بلکہ روح کی غذا بھی۔ ایسی مفید عادت کے لئے اور اسے بڑے پیمانے پر رائج کرنے کیلئے عالمگیر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے جگہ جگہ ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں

رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رو رہے ہوں مثلاً ہٹلر، مسولینی، چیانگ کائی شیک۔ بڑے بڑے آدمیوں کو اس طرح ڈھار مار کر روتے دیکھ کر عوام پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور وہ بھی بے اختیار رونے لگ جائیں گے۔ ذرا تصور کیجئے ایک بڑا سا سینما ہال ہے جہاں ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے زور زور سے رو رہے ہیں۔ کتنا خوبصورت منظر ہے۔ کیا یہ آپ کے شاعرانہ جذبات کو متحرک نہیں کرتا؟ یا پھر ہاکی، کشتی، فٹ بال کی طرح رونا بھی بطور ورزش کے سکھایا جائے۔ ہر شام کو شہروں اور دیہاتوں کے قریب میدانوں میں لاکھوں آدمی کھڑے کئے جائیں۔ جو چیخیں مار مار کر روئیں اور اپنی صحت کو بہتر بنا لیں۔ اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں، بلکہ موسیقی کی طرح "ملکۂ گریہ" "رونے کا بادشاہ" وغیرہ وغیرہ۔ اس پروگرام کو مقبول عام بنانے کے سیکڑوں طریقے برتے جا سکتے ہیں۔ صرف نمونہ کے لئے چند ایک یہاں درج کئے جاتے ہیں تا کہ سند رہے۔ باقی طریقوں کے لئے ڈیڑھ روپے کے ٹکٹ بھیجکر الراقم سے خط و کتابت کریں۔

رونے کی مختلف قسمیں ہیں۔ بچوں کا رونا تو آپ دیکھ چکے ہیں لیکن بعض بچے بہادر اور دلیر ہوتے ہیں۔ وہ اکثر گھنٹوں کیا

کئی کئی دن روتے رہتے ہیں۔ کھانا بھی کھاتے ہیں۔ کھیلتے بھی ہیں اور درمیان میں ہچکیاں لے لے کر لگاتار روتے رہتے ہیں۔ میں ایسے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر یہ کیا کیا نہ کر سکیں گے۔ یوں بھی تو بذاتِ خود یہ کو کم کارنامہ ACHIEVEMENT نہیں۔ اور میں تو اسے اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی کہ واٹرلو کی لڑائی، فرانس کے انقلاب اور سکندر کے حملہ کو دی جا سکتی ہے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے جیسے برسات کی بارش۔ ذرا اُستاد نے دو چار بید لگا دیئے تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر صاحب نے پچکارا ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا۔ پل میں بارش پل میں دھوپ۔ لیکن ایک رونے پر ہی کیا موقوف ہے، لڑکپن میں ہر کام ایسا ہوتا ہے۔ عجلت پسندی اور غیر مستحکمی ارادوں کی، بس انکا نام لڑکپن ہے۔ اور شباب تو اس سے بھی برا ہے۔ اول تو جوان ہو کر لوگ روتے ہی نہیں۔ اگر روتے ہیں تو بہت کم اور اس جگہ جہاں نہ کوئی دیکھ پائے نہ سُن سکے، جیسے کسی گناہ قبیحہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یونہی کبھی کبھی رسماً آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپکا دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی چیخ لیکن شاذ و نادر۔

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی رونا ہے کہ ہو ہو ہو کر کے

لبوں پر جھاگ لاکر آنسوؤں سے سفید سفید داڑھیوں کو تر کر لیا جائے۔ یہ رونا نہیں بلکہ رونے کی ہنسی اڑانا ہے۔ دراصل داناؤں نے ٹھیک کہا ہے کہ بڑھاپے میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ اور یوں بھی تو اس میں بوڑھوں کا کیا قصور ہے، دراصل یہ لوگ عطائی ہوتے ہیں رونے کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر رونا انھوں نے بطور فن یا ورزش کے سیکھا ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی

رونا ایک فن ہے، رونا ایک ورزش ہے، رونا ایک آرٹ ہے۔ موخر الذکر کو بچوں اور عورتوں نے خوب سمجھا ہے اور اپنایا ہے۔ میں نے وہ بچے دیکھے ہیں جو اس طرح سسکیاں بھر بھر کر روتے ہیں کہ آدمی کا جی خود بخود ان کی طرف کھچ جاتا ہے۔ دل میں ترحم اور ہمدردی کا جذبۂ عمیق موجزن ہو جاتا ہے اور وہ انھیں بازوؤں میں اٹھا کر بچکارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ اور عورتیں! ــــ رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کے رونے نے ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیے ہیں۔ ایک قلوپطرہ، ایک ہیلن، ایک مسز سمپسن آنسو سے بھری ہوئی آنکھوں سے ایک بلیغ نگاہ۔ اور شاید آج دنیا کی تواریخ مختلف ہوتی اگر تاریخ کے ہر صفحے پر کسی عورت کے دو چار آنسو

نہ ٹپکے پڑتے۔ یوں بھی عورت کے آنسوؤں کی بدولت کروڑوں گھروں میں ہر ساتویں دن ایک معاشری انقلاب آجاتا ہے۔ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ کمبخت مرد رونا نہیں جانتے۔ اور عورتیں آنسو بہا کر ہمیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ دنیا کے مرد اٹھیں اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس دام فریب کو پارہ پارہ کر دیا جائے کہ جس نے ہم غریب مردوں کو یوں جکڑ رکھا ہے۔ اٹھو مجاہدو اٹھو سرفروشی کی تمنا ------

وغیرہ وغیرہ یاد رہے کہ ہماری آزادی کی بہتر صورت رونا ہے۔ خوب روؤ، جی بھر کر روؤ۔ دن میں بار بار روؤ۔ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکینگے۔

ہوائی قلعے

تکلّفات

تھا نوی ہونا دوسری بات ہے مگر یہ خاکسار حاضر ہوا ہے اسی لکھنؤ سے جہاں "پہلے آپ" اور "نہیں حضرت پہلے آپ" کے تکلفات میں ٹرین چھوڑ دی جاتی ہے مگر وضع نہیں چھوڑی جاتی۔ اب ذرا خاکسار کا لکھنؤ سے حاضر ہونا ملاحظہ فرمائیے اور گنتی کے پندرہ منٹ ریڈیو پر مضمون پڑھنے کے لئے دیکھئے۔ انصاف سے کہئے گا کہ ایک لکھنوئیے سے اس پندرہ منٹ میں کتنی دیر اپنی شیروانی کا دامن درست کر کے ایک مناسب زاویہ سے بیٹھنے کی کوشش کریگا۔ کتنی دیر میں ریشمی رومال سے لبوں کو صاف کریگا۔ کتنی دیر کھنکھار کر آواز کے سُر درست کریگا۔ کتنی دیر شرمائے گا اور کتنی دیر اس کا انتظار کریگا کہ "سامعین" "ارشاد" کہکر تقاضہ کریں۔ یہاں کل پندرہ منٹ ہیں حالانکہ یقین جانیئے کہ ان میں سے ہر ادا کے لئے فرداً فرداً پندرہ منٹ

کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ مضمون سنایا بھی جائے۔ اسلئے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ خاکسار لکھنؤ سے حاضر ہونے کی رعایت سے محض ناسازیٔ طبع یعنی زکام، نزلہ، گلوگرفتگی، اختلاج قلب، دوران سر وغیرہ وغیرہ تمام ممکن اور ناممکن امراض کو بطور عذر پیش کر کے معذرت چاہے اور پھر جب تمام ہندوستان کے ریڈیو نواز بصیغۂ غائب اور ریڈیو اسٹیشن دہلی والے بصیغۂ حاضر اس خاکسار سے اصرار کریں تو یہ کمترین گویا مجبور ہو کر محض تعمیل ارشاد میں ایک شعر حاصل مضمون روانی کے ساتھ سنا جائے۔ مگر ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے منٹوں کی نہیں بلکہ گھنٹوں کی ضرورت ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ گھڑی دیکھتے رہو، جیسے ہی چھوٹی سوئی آٹھ پر اور بڑی بارہ پر پہنچے فوراً شروع کر دو۔ اپنا مضمون جو ایک ایک سکنڈ کے حساب سے ٹھیک اس وقت ختم ہو جائے جبکہ بڑی سوئی تین پر پہنچ جائے گویا ہم لکھنؤ سے آنے والے ایک آدمی نہیں بلکہ سوئزرلینڈ سے آنے والی کوئی ٹائم پیس ہیں۔

ممکن ہی کہ آپ کو اس باقاعدگی اور تہذیب کے مقابلہ میں شیخ ابراہیم ذوقؔ سے اتفاق ہو جنکا نظریہ یہ تھا کہ ؎

اے ذوقؔ تکلف میں ہی تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

مگر غور کیجئے تو یہ تعلیم سوائے خود غرضی کے اور کچھ نہیں سکھاتی۔ یقیناً آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے۔ مگر جس کے ساتھ تکلف نہیں کرتے اس غریب کی کیا گت بناتے ہیں، اس پر بھی تو غور کرنا چاہیئے۔ یہ کیا کہ محض اپنی تکلیف دور کرنے کی تو ایک راہ نکال لی اسکے بعد تمام دنیا گئی جہنم میں۔ لیکن لکھنؤ کا تکلف" ایثار، قربانی نفس کشی" اور اسی قسم کی خدا جانے کتنی خوبیاں سکھاتا ہے۔ اس تکلف کے ماتحت انسان ہر مصیبت خود ہی جھیل لے جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ بے تکلف بن کر دوسروں کے لئے عذاب بن جائے۔ مارے بے تکلفی کے بغیر کسی اطلاع کے رات کو ٹھیک دس بجے نازل ہوگئے، کسی دوست کے یہاں اور ہاں نہ ماں میں تیرا مہمان کے اصول پر عمل کرتے ہوئے طلب کیا اس سے کھانا مع چند فرمائشات کے جن کی تعمیل کے لئے خواہ وہ چوری کرے یا بال بچوں کا پیٹ کاٹے، کسی سے قرض لائے یا خود پیٹ پر پتھر باندھ کر سو رہے۔ مگر آپ کی بلا سے آپ کو اپنے کام سے کام۔ ایسے مہمان کے لئے میزبان کے دل کی گہرائیوں سے جو بد دعائیں نکلتی ہیں وہ قبول ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں، مگر شیخ ابراہیم ذوق کی روح ضرور شرمندہ ہوتی ہوگی کہ وہ کیسا غلط نظریہ قائم کر گئے ہیں۔ ایک لکھنوی صاحب کے لئے اس قسم کی بے تکلفی قطعاً ناممکن ہے۔ وہ اگر ناوقت کسی شہر میں پہنچے گا تبھی تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہے گا دیوار پر چسپاں ٹائم ٹیبل کو

بار بار رواں اور بہجے لگا کر پڑھ کر، میر تقی میر کی غزلیں گنگنا کر وقت کاٹ دیگا۔ صبح شریف آدمیوں کی طرح مہمان بن کر میزبان کے دروازہ پر پہنچے گا اور اس وقت یہ عالی ظرفی ملاحظہ ہو کہ جب میزبان ناشتہ چنے گا تو یہ مرد معقول بلا مبالغہ دو تین فاقوں سے بھی ہوگا تو یہی کہے گا کہ حضرت میں تو ناشتہ کر کے حاضر ہوا ہوں اب یہ اور بات ہے کہ قسما قسمی اور اصرار سے مجبور ہو کر ناشتہ کو اس صفائی سے تناول فرما جائے کہ صرف میزبان کو تکلفاً چھوڑ دے۔

ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے تکلف کو دنیا نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا مذاق اڑا کر اسکے فوائد کو نظر انداز کر دیا۔ ورنہ یہی تکلف ان تمام سیاسی، ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کا واحد حل ثابت ہوتا جو آج کل مفکرین عالم اور مدبرین وقت کا دماغ چرخ کئے ہوئے ہیں سب بے تکلفی اور المھرٹین ہی کا نتیجہ ہے کہ تخفیف اور توسیع اسلحہ کی گتھی کسی طرح سلجھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہندوستان کے لئے جدید دستور کی بھی ضرورت پیش آرہی ہے اور اس دستور کے لئے ہڑتال کی بھی ضرورت ہے۔ اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور چین و جاپان میں الگ کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام دنیا میں ایک آگ لگی ہوئی ہے اور امن و سکون کا کہیں پتہ نہیں۔

کاش تکلف کو اس طرح نظر انداز نہ کیا گیا ہوتا۔ اور بجائے اس کے کہ آج تخفیف و توسیع اسلحہ کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں یہ ہوتا کہ جرمنی برطانیہ کو لکھتا کہ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں ایک ہزار توپیں بنانا چاہتا ہوں۔ اسکے جواب میں برطانیہ پانچ سو توپیں مع اس مضمون کے خط کے بھیج دیتا کہ آپ نے غیرت برتی۔ اور بجائے برطانیہ سے توپیں طلب کرنے کے خود توپیں بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ بہرحال اس وقت برطانیہ کے پاس پانچ سو توپیں تیار تھیں جو ارسال خدمت ہیں۔ باقی انشاءاللہ بہت جلد تیار کر کے روانہ کی جائے گی۔ مگر آپ کو ہمارے سر کی قسم کہ ان کو اپنی ہی چیز سمجھ کر قبول فرمایئے گا اور آئندہ بھی خدمت لائقہ سے یاد فرماتے رہیئے گا۔ ان کے جواب میں جرمنی کی طرف سے ان توپوں کی قیمت روانہ ہوتی۔ پھر مسٹر بالڈون اور ہرہٹلر کے درمیان اسی قسم کے بحری پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جاتا کہ نہیں حضرت یہ نہیں ہو گا۔

"نہیں حضرت یہ نہ ہو گا۔"

"واللہ بھائی بالڈون آپ کو یہ دام تو قبول ہی کرنا پڑینگے۔"

"آپ کے سر عزیز کی قسم۔ ہٹلر صاحب یہ قیامت تک نہ ہو گا۔"

"ارے حضرت آپ کی توپیں ہماری تھیں تو ہمارا روپیہ آپ کا ہے۔"

"یہ صحیح ہے مگر آپ غیریت برت رہے ہیں۔"

"اس رقم کو واپس کر کے دل شکنی نہ فرمائیے۔"
"یہ رقم اور دہ تو ہیں سب آپ پر نچھاور ہیں۔"
"اس کے یہ معنی ہوئے کہ آئندہ کوئی فرمائش نہ ہو۔"
"یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ فرمائش غیروں میں ہوتی ہے یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے۔"
"تو آپ کو ہمارے سر کی قسم اس روپئے کو بھی آپ اپنا ہی سمجھئے۔"
"اچھا آپ نے دے دیا ہم نے پالیا اب یہ ہماری طرف سے جرمن قوم کے بچوں کو مٹھائی کے لئے دے دیجئے۔"
"قسم ہے ہمارے قومی جھنڈے کی جان عزیز کی کہ یہ نہ ہوگا۔"
"آپ تو واللہ مجبور کر رہے ہیں۔"
"اچھا تو اس کے معاوضہ میں نہ سہی تحفتاً دو چار سو ہوائی جہاز ہی قبول کر لیجئے۔"
"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے۔"
"ضرورت نہیں یہ ہماری خوشی ہے۔"
"آپ کی خوشی ہے تو اچھا یہی سہی۔"
اب آپ ہی بتائیے کہ اس قسم کے رواسم اور ان تعلقات کے بعد تخفیف یا توسیع اسلحہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض کر سکتے ہیں کہ شاید

جنگ چھڑ جاتی۔ مگر جنگ میں بھی اس تکلف کی کارفرمائی جس حد تک مفید ہو سکتی ہے اسکا تصور بھی بے تکلف دنیا نہیں کر سکتی۔ اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہو گئی تو دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابلہ پر برسوں صف آرا کھڑے رہتے اور حملہ کے سلسلہ میں دونوں طرف سے اصرار ہوتا کہ "آپ" اور "نہیں حضرت پہلے آپ"۔

رونا تو آتا ہے اس گہوارۂ تکلف ہندوستان پر۔۔۔ آج یہاں بھی تکلف کا نام و نشان نہیں ہے۔ کہیں جدید دستور کی ضرورت ہے اور کہیں جدید دستور کے لئے ہڑتال کی ضرورت۔ کہیں حقوق کا سوال ہے اور کہیں ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

حالانکہ اگر غور کیجئے تو تکلف کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کا حقوق طلب کرنا ہی نہایت چھوٹی اور گری ہوئی بات ہے۔ ہمارے بزرگ اگر اپنی کوئی چیز کسی کو دے دیتے تھے تو اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے وہ چیز دی اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ مرتے دم تک اس چیز کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا۔ اسکو واپس مانگنا یا اسکا معاوضہ لینا تو در کنار۔ خواہ پھر فاقوں پر نوبت پہنچ جائے یا چیتھڑوں سے لگ جائیں مگر جان کے ساتھ آن نہیں جا سکتی تھی۔

اور آج کل کا زمانہ ہے کہ سرکار کو جو ہندوستان دیا تھا اس کو نہایت فخر کے ساتھ طلب کیا جا رہا ہے۔ نہ ہوئے یہ کانگریس والے لکھنوی آپ سے سچ کہتے ہیں کہ اگر سرکار خود بھی ہندوستان واپس دینا چاہتی تو یہی کہا جاتا کہ کیوں سرکار اب یوں بھی ذلیل کیا جائیگا ہم کو۔ واللہ اسقدر تو ذلیل نہ کیجئے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اب کسی قابل نہیں مگر اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں کہ اپنی دی ہوئی چیز واپس لیں کاش ہم اس قابل ہوتے کہ ایسے ایسے پچاس ہندوستان آپ پر قربان کر دیتے مگر کیا کہیں کہ ؎

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہندوستان کے سلسلے میں اپنا پرایا کیا؟ آخر ہم خود کس کے ہیں یقین جانئے کہ آپ کے غلام ہیں۔ اور آپ ہیں کہ ہم ہی سے یہ غیریت برت رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شریفانہ تکلف کے جواب میں سرکار کی طرف سے بھی کوئی بخل نہیں ہو سکتا تھا مگر جب ہندوستان ہی نے تکلف چھوڑ دیا ہے تو دوسروں کا کیا سوال۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق کے سلسلہ میں اعداد و شمار اور فیصدی تک کے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں حالانکہ پہلے ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو حساب دوستاں در دل کہکر ٹال دیا جاتا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ اس چھچھور پن سے بچنے کے لئے اگلے وقتوں کے لوگ دس سے زیادہ گنتی ہی نہیں جانتے تھے

اور جن کو آج کل گیارہ کہا جاتا ہے اس کو وہ بھولے بھالے شرفاء دس کے اوپر ایک کہا کرتے تھے۔ اور امن وسکون کی نہایت شریفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ حقوق نیابت کا سوال تھا یہ مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کا جھگڑا تھا نہ الکشن بازی۔ بلکہ اس قسم کے تمام حوصلے نہایت غیر مضرت رساں طریقہ پر بٹیر بازی سے پورے کر لئے جاتے تھے۔ آپ نے بٹیر بازی کا مضحکہ اڑایا مگر اس انسانوں کی پالی یعنی الکشن پر غور نہ کیا کہ یہ کیا ہے۔ بٹیر کا کیا وہ تو ایک ادنیٰ سا جانور تھا فرض کر لیجئے کہ وہ بھاگ گیا تو بھگّا کہا گیا۔ مگر اس دورِ ارتقا میں یہ رجعت قہقری ملاحظہ ہو کہ بٹیروں کی جگہ انسانوں نے لے لی ہے۔ اچھے دل بُرے ہوتے ہیں، بٹیر چھچھے نہیں ہوتے بلکہ انسانوں میں سر پھٹول ہوتی ہے اور اسی پر سب کو بڑا ناز ہے۔ لکھنؤ کا تکلف تو ایک ڈھکوسلا تھا مگر یہ تمام باتیں آخر کیا ہیں؟

خیر یہ باتیں تو اس لئے عرض کر دیں کہ بات میں بات پیدا ہو گئی تھی اور مقطع میں نہیں بلکہ مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات پیدا ہو گئی تھی جس سے مقصود ترک بحث نہیں ہے بلکہ محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ تکلفات کو چھوڑنے والے کس حد تک غلط راستہ پر ہیں۔ لیکن ایک لکھنؤ سے حاضر ہونے والے کے لئے یہ کس قدر دقت کی بات ہے کہ

وہ اس روایتی تکلف کو یک لخت نظر انداز کر دے اور گھڑی کی سوئی کے اشارہ پر عمل پیرا ہوکر مضمون سنانا شروع کر دے۔ پھر لطف یہ ہے کہ سنائے تو کس کو سنائے۔ ماحول یہ ہے کہ ایک تنہا کمرہ ہی جس میں بیٹھے ہوئے مضمون پڑھ رہے ہیں بہ آواز بلند۔ یہ سچ ہے کہ ع

ساری دنیا گوش برآواز ہے

مگر بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ تنہائی میں باغیانہ تقریر کرنے کی مشق کر رہے ہیں۔ یا در و دیوار سے باتیں ہو رہی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب سامعین سے سمع خراشی کی معذرت نہ چاہیں اور سامعین ہر جملہ پر نہ سہی جا بجا مگر ارشاد نہ کہیں تو سنانے والے کا کیا خاک دل لگے گا؟ پھر مصیبت یہ کہ ہم بالکل آلۂ نشر الصوت کے رحم و کرم پر ہیں۔ اور آلۂ نشر الصوت سے زیادہ ہندوستان کی موسمی حالت پر ہمارے اس مضمون کی تقریر کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجئے کہ کہیں بادل گرج رہا ہے تو سننے والے بھی کہینگے کہ سخت بدتمیز ہے یہ شخص بھی مضمون سناتے ہوئے اس قدر واضح قسم کی ڈکار لیتا ہے۔ بلکہ اکثر حضرات کو تو یہ محسوس ہوگا کہ مضمون سناتے سناتے اس خاکسار پر چھت پھٹ پڑی ہے یا یہ خاکسار معہ کرسی اور میز کے الٹ گیا ہے۔ بہر صورت خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایک مضمون سنانے والے کی کیا کیا گت بنتی ہوگی۔ مگر یہ تمام باتیں مقدرات سے

وابستہ سمجھ لی جائیں تو ریڈیو والوں کو اسکا خیال تو رکھنا ہی چاہیئے کہ ایک پنجابی اور ایک بنگالی، ایک سرحدی اور لکھنوی سب کے لئے پندرہ منٹ کی قید تو ایک قسم کی زیادتی سی ہے نا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اس تمہید میں مضمون سے قبل پندرہ منٹ ختم۔

بوق تلبسم

بابو

بابو ہندوستان کی اس مخلوق کو کہتے ہیں جو دفاتر میں فائلوں کی چہار دیواری کے درمیان ناک کی پھنگی پر عینک لگائے ہوئے کاغذ سیاہ کرتی ہوئی نظر آئے۔ اور اس کے متعلق دیکھنے والے کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ اندازہ ہو سکے کہ سائنس داں نے

اپنے کمال سے ٹائپ کی طرح خط شکست لکھنے کی یہ انسانی صورت والی مشین ایجاد کی ہے جو پان بھی کھاتی ہے اور عینک بھی لگاتی ہے کبھی کبھی بات بھی کرتی ہے اور اکثر گھورتی بھی ہے۔ اور واقعی اگر بابو کی زندگی کا جائزہ لیجئے اور اسکے پروگرام پر غور کیجئے تو آپ کو اسکا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ انسان تو خیر برائے نام ہوتا ہے ورنہ زیادہ تر اسکے مشاغل مشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ روزانہ وقت مقررہ پر دفتر آنا۔ دفتر آکر ایک ہی قسم کے کام کو روزانہ انجام دینا مقررہ وقت پر دفتر سے جانا اور ایک مقررہ نظام کے ماتحت گھریلو زندگی بسر کرنا۔ عام انسانوں کی طرح بابو کی زندگی میں مختلف قسم کے مدوجزر بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کی دنیا کے صرف دو ٹکڑے ہوتے ہیں گھر اور دفتر، دفتر اور گھر۔ اور یہ دونوں ٹکڑے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم بھی بن کر رہ جاتے ہیں۔ یعنی بابو کا گھر دفتر کے سہارے قائم رہتا ہے، اور دفتر گھر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر بابو کو گھر کی فکر نہ ہو تو دفتر کی ہرگز پروانہ کرے۔ اور اگر دفتر نہ ہو تو گھر کا خدا ہی حافظ ہے مگر باوجود اس ربط کے بابو کی گھریلو اور دفتری زندگی میں ایک مستقل تضاد ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر زیادہ گہرائیوں میں جائیے تو اس تضاد میں بھی آپ کو یکسانیت کی جھلک نظر آئے گی بلکہ اگر بابو سے پوچھئے تو شاید وہ گھبرا کر گھر کو دفتر اور دفتر کو گھر کہہ جائے اسلئے کہ اس بیچارے کی

زندگی بحصۂ مساوی جن دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے ان میں سے ایک کو وہ گھر کہتا ہے اور ایک کو دفتر۔ اور ان دونوں جگہوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ ذمہ داریاں اس پر کچھ اس طرح ہوتی ہیں کہ اسکو جلدی میں گھر اور دفتر میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ غور کرنے کے بعد وہ بتا سکتا ہے کہ دفتر اور گھر دونوں میں گھر کون سا ہے اور دفتر کون سا۔

بابو نے اس غلط مبحث سے بچنے کے لئے دفتر اور گھر میں چند موٹی موٹی پہچانیں اپنے ذہن میں محفوظ کرلی ہیں تاکہ گھر اور دفتر میں آسانی کے ساتھ امتیاز ہو سکے۔ مثلاً گھر پر بوا ئن ہوتی ہیں اور دفتر میں صاحب۔ گھر پر بچے ہوتے ہیں اور دفتر میں اسکے دوسرے ہمعصر بابو۔ گھر پر کہار ہوتا ہے اور دفتر میں چپراسی۔ گھر پر کھانے کو ملتا ہے اور دفتر میں کھایا پیا ایک کیا جاتا ہے۔ گھر پر لیٹا جاتا ہے اور دفتر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر پر نون تیل لکڑی کی فکر ہوتی ہے اور دفتر میں کیش بک۔۔۔۔ اکاؤنٹ بک اور لیجر کی فکر۔ گھر پر دھوتی باندھی جاتی ہے اور دفتر میں دھوتی کے اوپر ایک شرعی پائجامہ نما پتلون۔ گھر میں حقہ یا ناریل پیا جاتا ہے اور دفتر میں آنکھ بچاکر بیڑی۔ گھر پر بچے پریشان کرتے ہیں اور دفتر میں اہل معاملہ اور اہل غرض حضرات گھر پر بیوی کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے اور دفتر میں بڑے بابو یا چھوٹے صاحب کی۔ ان چند موٹی موٹی پہچانوں میں سے ایک

بابو نہایت آسانی کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے گھر پر یا دفتر میں، دفتر میں یا گھر پر۔

بابوؤں کی سینکڑوں قسمیں ہوتی ہیں اور بھانت بھانت کے بابو اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ مگر ان سب کی زندگی کم و بیش ملتی جلتی ہوتی ہے اور ان سب کے حالات تقریبًا یکساں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ڈاک بابو ہوں یا تار بابو۔ ٹکٹ بابو ہوں یا اور کسی قسم کے بابو۔ مگر ان سب کے حالات زندگی صرف یہ ہوتے ہیں کہ دفتر میں کثرت کار اور گھر پر کثرت اولاد۔ دفتر میں ترقی کی فکر اور گھر پر بیوا ان کے تقاضے سے لڑکی کی شادی کا غم۔ دفتر میں بڑے بابو کا اندیشہ اور گھر پر رام چرن کی مہتاری کا خطرہ۔ دفتر میں اہل معاملہ کے سامنے شیر اور بڑے بابو کے سامنے بھیگی بلی اور گھر پر بچوں کے باپ اور بچوں کی ماں کے صاحبزادے۔ گھر پر مہاجن سے قرض لینے کی فکر اور دفتر میں پہلی تاریخ کے لئے دن گننا۔ مختصر یہ کہ ایک بابو کی تمام سیاست، تمام قابلیت اور تمام اہلیت کا دائرہ محدود ہے گھر اور دفتر کے درمیان۔ اسکے علاوہ خواہ دنیا میں کچھ ہو اسکو خبر نہیں ہوتی۔ اس کی بلا سے اسپین کی حکومت تبدیل ہو جائے اس کو تو بڑے صاحب کی تبدیلی کی خبر بھی عین وقت پر ہوتی ہے۔ ہر ہٹلر کے ارادے کیا ہیں اس پر وہ غور کرے جس کو بڑے بابو کے

ارادوں کو سمجھنے سے فرصت ہو۔ جدید دستور کے نشیب و فراز اسکے نزدیک مہمل ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ دفتر میں جو جدید انتظام ہوتا ہے وہ اسکے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جشن تاج پوشی میں اسکے نزدیک سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوا کہ دفتر میں ایک دن کی چھٹی تھی اور اسی دن گھر کیلئے جنس خرید کر لانا پڑی۔ اور تمام دن غلّہ کی منڈی میں ترازو اور باٹ سے واسطہ پڑا۔ ہندوستان کے سیاسی جمود کا جو کچھ بھی نتیجہ ہو بہرحال وہ تو یہ جانتا ہے کہ اسکے دفتر پر جمود کی کیفیت نہ کبھی طاری تھی اور نہ آئندہ اس قسم کی کوئی امید ہے۔ جمعیتہ اقوام کا چونکہ اس کے دفتر سے کوئی تعلق نہیں ہے لہذا وہ اس سے دلچسپی لینا ہی نہیں چاہتا۔ ہندوستان کی قومی زبان اردو ہے یا ہندی اسکے لئے دونوں برابر ہیں۔ اسلئے کہ اسکو تو گھر میں ہندوستانی بولنا ہے اور دفتر میں انگریزی لکھنا ہے۔ فقیراپی کی سرگرمیوں پر وہ اسلئے غور نہیں کرتا کہ جہاں تک اسکا خیال ہے فقیراپی کا کوئی اثر اسکے دفتری معاملات پر نہیں پڑسکتا۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا کے تمام معاملات کو اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک سے اگر دیکھتا بھی ہے تو اپنے سے غیر متعلق سمجھ کر نہایت مہمل سمجھتا ہے ورنہ عام طور پر وہ اپنے فائلوں ہی کو ختم کرنے اور بچھڑے ہوئے کام کو نپٹانے میں ایسا مصروف رہتا ہے کہ اسکو دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔

دفتر کی مصروفیتوں سے کچھ کم اسکے گھر کی مصروفیتیں نہیں ہوتیں
اگر آپ بابو کی گھریلو زندگی دیکھیں تو سب سے پہلے وہ آپ کو کندھے
پر رومال ڈالے ہوئے ترکاری منڈی میں نظر آئیگا جہاں اسکی تمام
توجہ شلجم اور پردل کی جانب مبذول ہوگی۔ منڈی سے ترکاری لے کر
واپس ہوتے ہوئے بنیئے کی دکان اسکا دوسرا اسٹیشن ہوگا۔ اور وہاں
سے ایک ہی رومال میں مختلف پوٹلیاں باندھے ہوئے اور ایک ہاتھ میں
کٹورا لئے ہوئے جس وقت وہ اپنے گھر کی طرف تیز قدم اٹھائے گا۔
اس وقت بھی اسکے دماغ میں سوائے اسکے اور کوئی فکر نہ ہوگی کہ
آٹھ بج چکے ہیں ابھی اسپتال جانا ہے۔ پھر کھانا کھانا ہے۔ پھر ٹھیک
وقت پر دفتر پہنچنا ہے۔ چنانچہ گھر پہنچتے ہی تمام سودا بیوائین کے
حوالہ کرکے وہ مختلف چھوٹی بڑی شیشیاں رومال میں باندھے گا
نسخے جیب میں رکھے گا پھر کسی بچے کی انگلی پکڑے گا، کسی کو گود میں
لے کر اسپتال پہونچ جائے گا۔ اسپتال میں بھی بار بار اسکی نظر گھڑی
کی طرف ہوگی۔ اور اسکی رفتار کے تناسب سے کمپاؤنڈروں کی
خوشامد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ لڑکے کی آنکھ میں جلدی سے
دوا ڈال دیجئے اور اس لڑکی کا کان دھو دیجئے مجھے دفتر کی دیر ہو رہی
ہے۔ لڑکے کی آنکھ میں دوا ڈلوانے اور لڑکی کا کان دھلوانے کے
بعد بیوائن کے لئے دوا لینا بھی ضروری ہے ورنہ وہ برا مان جائیگی۔

کہ میرے کلیجہ کی دھڑکن کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اسپتال سے دواؤں کے خزانہ سے مالا مال لڑکی کو لادے اور لڑکے کی انگلی پکڑے ہوئے جس وقت بابو صاحب گھر پہونچیں گے اس وقت دفتر جانے میں مشکل سے چند ہی منٹ باقی ہونگے۔ جلدی جلدی الٹے سیدھے دس پانچ لقمے مار کر فوراً دفتر کے کپڑے پہنیں گے۔ ایک آدھ کش حقہ کا لینگے اور بستہ سنبھال کر چھڑی بغل میں دبائے اس طرح دفتر کی طرف بھاگیں گے کہ گویا کوئی لاٹھی لئے ہوئے پیچھے آرہا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ کی تمام چہل پہل ان کے لئے قابل توجہ نہ ہوگی۔ اگر کسی نے سلام کیا تو بغیر دیکھے ہوئے جواب دے دیا۔ اگر کسی نے آواز دی تو بہرے بن کر قدم اور تیز کر دیئے۔ اب اگر کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ راستہ میں کیا ہو رہا تھا تو آپ اسی طرح کورے نکلیں گے کہ گویا اس راستے سے گذرے ہی نہیں ہیں۔

دفتر میں بابو جی کی شان البتہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے تاہم اگر کوئی اہل معاملہ آگیا تو آپ اپنے کو اسکے نزدیک لاٹ صاحب سے کم ثابت نہیں کرتے خصوصاً جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس شخص کے کاغذات میرے ہی پاس ہیں اور میں ان کو نہایت آسانی کے ساتھ گڑبڑ میں ڈال سکتا ہوں۔ یا اگر چاہوں تو اسی وقت نکال کر برسوں کا کام منٹوں میں کر سکتا ہوں۔ رشوت لینے کا خیال نہ سہی۔ بلا وجہ پریشان

کرنا بھی نہیں چاہتے۔ اگر اہل معاملہ کا کام نکل جائے تو انکا کوئی ہرج بھی نہیں ہے مگر باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اہمیت جتانا بھی ضروری ہے اور چونکہ اہمیت اسی طرح جتائی جا سکتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات کو نہایت مہتم بالشان بنا کر پیش کیا جائے۔ لہذا سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو بھی عنقا ثابت کرنے کی کوشش کرینگے مثلاً اہل معاملہ نے نہایت خوشامد کے ساتھ کہا۔

"بابو جی آپ چاہیں تو چٹکی بجاتے میرا کاغذ نکلوا سکتے ہیں۔"

بابو جی پہلے تو اپنے کام میں مصروف رہینگے اور کوئی جواب ہی نہ دینگے اسکے بعد جب وہ پھر کہے گا۔ "بابو جی"

تو آپ صرف کاغذ پر نظر جمائے ہوئے اسکی طرف دیکھے بغیر کہینگے۔ "ہاں ہاں کہہ تو دیا کہ بڑے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے وہ کاغذ۔"

اہل معاملہ پھر کھینسیں نکال کر کہے گا۔ "بابو جی بڑا نقصان ہو جائیگا آپ ذرا مہربانی کر دیں تو کام نکل جائے گا۔"

بابو جی چشم غلط انداز سے اسکو دیکھتے ہوئے کہینگے تم دیکھ رہے ہو کہ میں خالی تو بیٹھا ہوا ہوں نہیں کہ بس تمھارا کاغذ ڈھونڈھنے لگوں جب فرصت ہوگی اس وقت پر لانے فائل نکال کر تلاش کر دونگا۔"

اہل معاملہ خوشامدانہ کہے گا۔ "یہ تو ٹھیک ہے بابو جی مگر بڑی

مہربانی ہوگی میرا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔"

اب بابوجی اس کو جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھیں گے اور اپنے کام میں مصروف رہینگے۔ یہاں تک کہ وہ کٹہرے کے باہر پہلے تو کچھ دیر تپائی پر بیٹھ کر اونگھے گا۔ اس کے بعد الہامی طور پر اسکے ذہن میں آئے گا کہ بابوجی کو پان کھلانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ فوراً پان لے کر پھر بابوجی کی خدمت میں حاضر ہوگا۔

"بابوجی! ---- یہ پان لے لو۔"

بابوجی کی نظریں فوراً اسکی طرف اُٹھ جائینگی اور وہ پان لیتے ہوئے کہیں گے:۔

"پان تو ابھی کھا رہا تھا۔ خیر لاؤ۔"

جب اہل معاملہ کے پان بابوجی کے منھ میں پہونچ جائینگے تو وہ خود ہی کہیں گے:"ابجی تو ہولی۔ دیوالی سب گذر گئی اور تم ہم کو بھولے ہی رہے۔"

اہل معاملہ تاسف کے ساتھ کہے گا۔"کیا کہیں بابوجی کچھ ایسی ہی فکریں تھیں۔ اب بڑے لڑکے کی شادی ہی جلتی چلے ہے مٹھائی کھانا۔"

بابوجی کہیں گے۔"اب کی کیا کوئی باغ نہیں لیا ہے۔ کیا آموں کی فصل میں بھی سوکھا ہی رہے گا۔"

اہل معاملہ کہے گا۔"نہیں بابوجی! بھلا یہ کوئی بات ہے۔

تمھارا باغ حاضر ہے چاہے باغ چلو چاہے گھر پہ منگا لو آم۔"

بابو جی آموں کا معاملہ پختہ کرنے کے بعد کہیں گے۔ "پارسال تو خیر اچار ہی مل گیا تھا ابکی تو وہ بھی غائب ہی رہا۔ سیٹھ جی تم روز بروز سیانے ہوتے جاتے ہو۔"

سیٹھ جی اچار کے سلسلہ میں اپنی کوتاہی کا عاجزانہ اعتراف کرنے کے بعد جب اچار بھیجنے کا وعدہ کر لینگے تو بابو جی نہایت خلوص کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں ان سے پہلے تو کچھ مشورہ کرینگے اسکے بعد آگاہی پر روپیہ لینے کا تذکرہ چھیڑ کر اس بات کی کوشش کرینگے کہ سیٹھ جی خود ہی اسکے لئے آمادہ ہو جائیں اگر سیٹھ جی ہوئے کوئی بدھو اور تیار ہو گئے تو اسی دن ان کا کاغذ ڈھونڈھ دیا گیا اور بابو جی خود انکے زر خرید غلام نظر آنے لگے۔ اور سیٹھ جی نے ٹال مٹول سے کام لیا تو آموں اور اچار کے وعدہ کے باوجود اور پانوں کے باوجود ان کا کاغذ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر وہ اس وقت ملے گا جب سیٹھ جی کے دوڑتے دوڑتے چیتھڑے ہو جائیں۔

بہرحال کچھ بھی ہو بابو کی دفتری زندگی کے وقار اور ان کے بابوانہ اقتدار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے اور ایسے ایسے خدا جانے کتنے اہل غرض دفتر میں بابو جی کے حضور ناک رگڑتے اور ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خود بابو جی کو بھی اس دفتر

میں بڑے بابو اور چھوٹے صاحب کے سامنے اسی قسم کی باتیں کرنا پڑتی ہوں۔
دفتر سے واپسی پر بابو جی کا حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے بغل میں بستہ اور چھتری سر پر کسی بے ڈھنگے زاویہ سے رکھی ہوئی ٹوپی۔ ہاتھ میں رومال، باچھوں سے بہا ہوا پان اور چہرہ پر دن بھر کی خستگی کے تمام نقوش نمایاں مگر دماغ پر زور دے دیکر یہی سوچتے جاتے ہیں کہ بیوائن نے دو پیسہ کے چقندروں اور ایک پیسہ کے پالوں کے علاوہ اور کیا کہا تھا کہ لیتے آنا اسلئے کہ خیال یہ بھی ہے کہ اگر وہ چیز یاد نہ آئی تو گھر پہونچکر پھر بازار آنا پڑیگا۔ مختصر یہ کہ شام کے قریب بابو جی لدے پھندے گھر پہونچتے ہیں اور اگر گھر پہونچکر پھر گھریلو افکار میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ابکی ہرگز مکان دار کو کرایہ اس وقت تک نہ دونگا جب تک کہ چھت نہ بنوا دے۔ تمام چھت ٹپکتی ہے اور اگر اس نے واقعی چھت بنوادی تو کیا کرایہ دینا ہی پڑیگا۔ حالانکہ اگر اس مہینہ کرایہ نہ لیتا تو اچھا تھا اسلئے کہ جوتہ بالکل ٹوٹ گیا ہے اور بیوائن اپنے بھائی کے لڑکے کے مونڈن میں بھی جانا چاہتی ہے، اسکا خرچ الگ ہے۔ لہذا ان تمام باتوں پر ایک ناریل پی کر غور کرنا چاہیئے اور اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو روٹی کھا کر سو رہنا چاہیئے۔

برق تبسم

موٹرسائیکل

دل میں جب پنکھے لگ جاتے ہیں تو وہ دل عاشق ہو جاتا ہے
یہ ترکیب تو سبھوں کو معلوم ہے۔ مگر بے جان کو جان دار بنانے
کی بھی ایک ترکیب ہے۔ سائیکل میں انجن لگا دیجئے، بس وہ
جان دار ہو جائے گی۔ ذروں پر دھڑکنے لگے گی، مچلنے لگے گی۔
وہ دھڑکتی تو ایسا ہے کہ اچھا خاصا آدمی اسے سن کر "نجدی"
ہو جائے اور سرزمین نجد تک تو جنگ کی وجہ سے پہونچنا مشکل ہو گیا
ہے مگر ہاں یہ دھڑکن اسی مقابلے کی دوسری سرزمینوں کا طواف
کرنے پر ضرور مجبور کر دے۔

پیٹرول کی کمی نے انسان کے حیات و جذبات کو بری طرح
مجروح کیا ہے۔ عاشقوں کی موٹریں یا تو گراج میں بند ہیں یا پھر

میدانِ جنگ میں لوگوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرنے میں مصروف ہیں اور یہ بیچارے نوجوان پھٹے رکشوں، سائیکلوں یا پھر اپنی ٹانگوں پر ہی نعرہ ہائے عشق لگاتے نظر آتے ہیں۔ پیدل چلتے چلتے تھک جاتے ہیں تو دردِ فراق جھیلا نہیں جاتا اور اس فراق میں انھیں "فراق" ہی یاد آتے ہیں۔ ہمارے ایک "پیدل شاہ نجد" تھک کر چور ہونے کے بعد فراق کو یاد کر رہے تھے ؎

میں رنگ و بوئے محبت کی نرمیاں ہوں فراق
کسی کے نازو نزاکت سے کھیل سکتا ہوں

مگر برا ہو زمانے کا کہ اس نازو نزاکت کے کھیل کے لئے عین وقت پر ملک میں پٹرول گھٹ گیا۔ لیکن اگر شباب کے ساتھ خوش قسمتی ہو اور خوش قسمتی کے ساتھ موٹر سائیکل اور پٹرول ہو تو پھر زندگی بڑی پرلطف اور جینے کے لائق ہو جاتی ہے۔ زیادہ نہیں آج سے دو سال قبل کالج میں تقریباً پندرہ بیس موٹر سائیکلیں دھڑکتی نظر آتی تھیں مگر آج صرف انکی ہلکی سی یاد باقی ہے۔

نادر شاہ نے دلّی میں قتلِ عام کیا تھا۔ مگر یہاں پٹرول راشننگ نے قتلِ عام نہیں بلکہ قتلِ خاص کر دیا۔ جنگ کے پہلے برسات کے مچھروں کی طرح موٹر سائیکلوں کی تعداد اَن گنت تھی لیکن اب کوئٹہ کی زلزلہ کی تباہی کی طرح انکی آبادی تباہ ہو کر

رہ گئی ہے۔ پہلے دل کے ساتھ سائیکلیں بھی دھڑکا کرتی تھیں مگر آخر وہی دل لوگوں کے کام آیا جس نے ایک زمانہ میں ایران و ہندوستان میں واویلے مچائے تھے اور لے دے کر وہی بیچارہ ہے جو دنیا و مافیہا، جنگ و صلح، پٹرول اور راشننگ سے بے نیاز ہوکر دھڑکے چلا جاتا ہے

ہمارے کالج میں بہت سی موٹر سائیکلیں تھیں مگر اب لے دے کر اللہ کے نام کے ساتھ بس ایک ہی رہ گئی ہے۔

کالج کے وقت پٹنہ کے محبوب انتہائی مشرقی گوشہ سے یہ سائیکل آفتاب امید کی طرح طلوع ہوتی ہے اور کالج کے دروازہ میں اسی طرح داخل ہوتی ہے جیسے جنگ ٹیونیشیا کے بعد الکزنڈر باب الفتح میں داخل ہوا تھا۔

ان سائیکلوں سے دلچسپ رومان وابستہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی معقول سی موٹر کا پیچھا کیا جاتا ہے اور اکثر پیچھا کرتے کرتے سائیکل سوار آگے نکل جاتا ہے۔ کار بیچاری آگے نکلنے کی کوشش کرتی ہے مگر سائیکل سوار سڑک پر اسی شان سے فرّاٹے بھرتا ہو جیسے کہ یہ گرینڈ ٹرنک روڈ ہو اور وہ خود شیر شاہ کا کوئی قریبی رشتہ دار۔ اسی طرح اسی سائیکل کے ذریعہ ایڈ وینچر بھی کئے جاتے ہیں۔ مجھے خود ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ میں ان دنوں غالباً دسویں جماعت میں

پڑھا کرتا تھا۔ اسکول سے فوراً ہی چھٹی ہوئی تھی اور میں آہستہ خرامی کرتا ہوا گھر کی طرف آرہا تھا۔ سامنے دور پر ایک موٹر سائیکل چمکی اور پھٹا پھٹ کرتی ہوئی تیزی سے آگے آتی گئی۔ ایک دیہاتی بیچارہ زمین پر اپنی گٹھری رکھ کر سڑک کے کنارے ذرا دم لینے بیٹھا تھا۔ سائیکل سوار کی نظر دیہاتی پر پڑی اور وہاں سے پھسل کر اسکی گٹھری پر پھر گیا تھا، رفتار کم ہوئی، نزدیک پہنچتے ہی اس مسخرہ نے ایک ہاتھ سے گٹھری اٹھالی اور سائیکل یہ جا اور وہ جا۔ دیہاتی بیچارہ کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔ میں اُس کے پاس پہونچا اور اپنی مکمل ہمدردی کا یقین دلایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس گٹھری میں تھوڑی سی کھٹائی اور ستو کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ سائیکل سوار نے دیہاتی کی آنکھوں میں خاک ڈالی اور دیہاتی نے ستو۔ میرے خیال میں پلہ برابر ہونے میں بہت ہی تھوڑا فرق رہا۔ یہ بات تو طے ہے کہ خاک بھی سفوف ہے اور ستو بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک آنکھوں میں جھونکا جاتا ہے اور دوسرا اسفہ میں۔ سفوف ہاضم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں دُبلے پتلے سے۔ قدیم عظیم آباد کے صحیح نمائندے۔ ان کے پاس ایک سائیکل ہے جو "علم سینہ بہ سینہ" کے قاعدہ پر غالباً "اوپر" سے چلی آرہی ہے۔ اس سائیکل کو اپنے سوار کا انجر پنجر ڈھیلا کردینے میں خاص کمال حاصل ہے۔ اکثر

چلتے چلتے یہ تھم جاتی ہے اور کبھی چیخ چیخ کر رُک جاتی ہے۔ غرض منزل مقصود تک پہونچتے پہونچتے کبھی اسکا سانس پھولتا ہے اور کبھی اس پر فالج گر جاتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر اسی سائیکل کے ہاتھوں ہمارے دوست نے بہت زک اٹھائی ہے اور اکثر مرثیہ کے انداز میں انھیں بڑے ضبط سے "دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا" پڑھنا پڑا ہے مگر انھیں اپنی سائیکل اتنی پیاری ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ اور دو چار ہاتھ کیا اگر لب بام میلوں دور بھی رہ جائے تو انھیں کوئی پرواہ نہیں بس سائیکل ان کے پاس رہنی چاہئے۔

کئی دفعہ یہ ہوا کہ پوری رفتار سے کسی کے پیچھے اڑے جا رہے ہیں کہ یک بیک بیمار غم کو ہچکی آتی ہے، سائیکل کو سکتہ لگ جاتا ہے اور ہزار کوشش کے بعد وہ "قطب از جا نمی جنبد" ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گرم سائیکل ٹھنڈی ہوتی ہے۔ امیدوں پر اوس اور ریس میں شکست۔ یہ ہوتا ہے اس دوڑ کا ماحصل۔ غصہ آتا ہے، ناچ جاتے ہیں مگر دو تین میل سائیکل ڈھکیلنے سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اور اس پر بھی وہ سائیکل ان کی اپنی ہے۔ اور اسی سے انھیں محبت اور وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ غنیمت ہے ان کی سائیکل کا دم کہ جسکے بل بوتے پر کبھی رومانس اور کبھی ایڈونچر کا سامنا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سبھوں کو معلوم ہے کہ

اگر ایڈونچر اور رومانس کا ساتھ ہو تو زندگی "چیناچور گرم" کی طرح چٹ پٹے دار ہو جاتی ہے۔ اور آپ جانئے سائیکل سواروں کے ایک ہاتھ میں رومانس اور دوسرے میں ایڈونچر ہوتا ہے۔ اور زندگی بھنتے ہوئے چنے کی طرح سائیکل پر پھٹا پھٹ کرتی رہتی ہے۔

ترنگ

چھینک

دنیا میں سات عجائبات تو مشہور ہیں مگر آٹھویں عجیب چیز کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور اس عدم توجہی کی وجہ وہی "چراغ تلے اندھیرا ہے"۔ یہ آٹھویں چیز اتنی عام ہے کہ اسکی طرف خیال کا جانا ذرا مشکل ہی کام ہے۔ انتظار کی تکلیف دیئے بغیر میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ دنیا کی یہ آٹھویں عجیب چیز چھینک ہے۔

اس چھینک سے ایسے ایسے عجائبات اور معجزات ظہور میں آتے ہیں کہ انسان حیرت کرنے لگتا ہے۔ چھینک کا ذکر آتے ہی ہنسی آجاتی ہے اور ہنسی اس لئے آتی ہے کہ ریل کے سفر میں سیٹھ جی کا واقعہ خیال آجاتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے۔ چھینک ہی کی وجہ سے یارائے ضبط نہ رہا اور کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چھینک آتی ہی کیوں ہے؟ اگر یہ سوال آپ طبّی طرح پر کرینگے تو میں کہونگا کہ ناک میں کچھ کیڑے ہوتے ہیں اور جب انکی آپس میں لڑائی ہوتی ہے یا انکی مجلس حال و قال منعقد ہوتی ہے تو چھینکیں آتی ہیں۔ یہ کیڑے بھی تو آخر جاندار ہوتے ہیں ان کے بھی دل ہوتا ہے اور اس دل میں امنگیں ہوتی ہیں۔ جب کبھی ان امنگوں نے زور کیا آپ کو ایک آدھ چھینک آگئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ہندوستان کو اتنی چھینکیں آئیں کہ وہ بے حال ہو گیا اور اس وقت تک اُس تباہ حالی کے اثرات ختم نہ ہو سکے ہیں۔ اگر ان کیڑوں کے درمیان غدر مچتا ہے تو پھر آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس کا نتیجہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی طرح آپ بھی بے حال ہو جاتے ہیں اور جس طرح غدر کے بعد سلطنت تیموری نے دم توڑ دیا تھا اور انگریز سر بر آرائے حکومت ہوئے تھے اُسی طرح آپ کی تندرستی وقتی طور پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ زکام آپ پر قبضہ جماتا ہے۔

اور اکثر تو زکام سے شروع ہو کر نمونیا تک ہو جاتا ہے۔ بات صاف ہے ان کیڑوں میں غدر مچا کر زکام اپنا استقبال چھینکوں سے کراتا ہے یہ تو طبّی سوال کا طبّی جواب ہے۔ آپ پوچھیں گے غیر طبّی جواب کیا ہے؟ سنیئے! چھینکیں صرف اس لئے آتی ہیں کہ آپ کو تنگ کریں۔ خواہ مخواہ ہی کسی کام میں روڑا اٹکائیں یا پھر آپ کو کچھ گھڑکیاں سنوادیں۔

مشاعرہ ہو رہا ہے۔ حفیظ جالندھری نے "ابھی تو میں جوان ہوں" والی نظم شروع کی۔ ابھی "ساقیا" پر انھوں نے تان لگائی ہی تھی کہ آپ کو چھینک آگئی۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہ کتنی بے موقعہ بات ہے۔ پاس والے آپ کو انتہائی غیظ و غضب کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے آپ نے انکا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

اسی طرح سینما میں "زندگی" فلم دکھایا جارہا ہے۔ سہگل کی دلکش موسیقی سے ہال گونج رہا ہے۔ جس وقت اسکا بہترین گانا شروع ہوا اسی وقت کیڑوں نے آپ سے غداری کی اور اندولن مچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو مسلسل چھینکیں آنا شروع ہوئیں۔ اب لوگ آپ کا تماشہ دیکھیں یا فلم کا۔ آپ اس وقت انتہائی تکلیف اور ذلّت محسوس کرتے ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتے۔ غصہ میں ناچ جاتے ہیں پر

ناک کے اندر کیڑوں کا ناچ نہیں رکتا۔ ناک مسلتے مسلتے پھول کر ٹماٹر ہو جاتی ہے۔ مگر صبر کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہیں۔

چھینک کبھی کبھی "تائیدِ غیبی" بن کر بھی آتی ہے۔ آپ کی کوئی چیز چوری کرنے کی نیت سے کوئی ذات شریف کمرے کے اندر داخل ہوتے ہیں اسی اثنا میں کہیں آپ آجاتے ہیں۔ کام ادھورا چھوڑ کر "دبک" جانے کی سخت ترین ضرورت پیش آجاتی ہے۔ پردے کے پیچھے یا پلنگ کے نیچے غرض جیسا موقعہ ہوا یہ ذات شریف چھپ جاتے ہیں۔ چھپنے کے بعد کافی اطمینان ہو جاتا ہے گرچہ ڈر کی وجہ سے دل میں پنکھے لگے رہتے ہیں۔ مگر یکبارگی چھینک کی روح فرسا ٹریجڈی رونما ہوتی ہے۔ چور صاحب چھینکتے ہیں اور اس طرح حوالات کے دروازہ کو اپنے لئے وا کر دیتے ہیں۔ آپ کے لئے تو یہ چھینک تائید غیبی ہوئی مگر بیچارے چور کے لئے آفت عظیم۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹی کے لئے یہ رحمت بن کر آئے۔ کبھی کبھی چھینک خاصا مزہ دے جاتی ہے۔ مدتوں کی تمنائے ملاقات بر آتی ہے۔ پچھلی رات کا سناٹا ہے۔ گھر میں سب سوئے ہیں۔ "چوری چھپے" کی ملاقات کا اس سے بڑھ کر کوئی وقت نہیں۔ اور آپ جیسا وقت سے فائدہ اٹھانے والا بھلا کیونکر چوک سکتا ہے۔ یہ ملاقات صحن ہی کے کسی

کونے میں شروع ہوتی ہے مگر ابھی اس اندھیرے میں آپ جی بھر کر انھیں دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ، کی ناک آپ سے بے پناہ غدّاری کا ثبوت دیتی ہے۔ پھر کیا ہے، کسی کی آنکھ کھل جاتی ہے اور کوئی نیند میں کسمساتا ہے اور آپ دونوں دبے پاؤں اس طرح بھاگتے ہیں کہ کیا شیطان لاحول سے بھاگے گا۔ غرض یہ ہیں چھینک کی ستم آرائیاں جو وقت وصل طبل جنگ کا کام کرتی ہیں

طالب علموں کے لئے تو چھینک اکثر خاصی مصیبت ہو جاتی ہے۔ کلاس میں پروفیسر پڑھا رہا ہے اور آپ ہیں کہ چھینکے جا رہے ہیں۔ پروفیسر کو تو اس نازیبا حرکت پر غصّہ آتا ہی ہے مگر آپ کے ساتھی بھی بہت ہی چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور کہیں یہ چھینک مسلسل جاری رہی تو پھر تمام بے چین نگاہیں شدت سے آپ کے اخراج کا انتظار کرتی ہیں اور جب تک آپ "کلاس بدر" نہ کر دیئے جائیں کوئی چین نہیں لیتا۔ یہ ذلت صرف چھینک کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑتی ہے۔

سنتے ہیں جنت میں ہر طرح کے آرام ہیں اور کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں۔ اگر کہیں وہاں چھینک کا وجود ہوا تو بے چار

مشکل کا سامنا ہوگا۔ نہ شعر و شاعری ہی ٹھیک سے ہو سکے گی اور نہ حور و غلمان کی صحبت ہی کا لطف اٹھایا جا سکے گا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو چھینک کسی بڑی سزا سے کم نہیں۔ اور جب یہ سزا ٹھہری تو پھر جنت میں اس کا کیا کام۔ اس کے لئے تو سب سے بہتر جگہ دوزخ ہے۔ ہلکے گناہوں کی سزا صرف چھینک رکھی جائے تو وہ پاداش کے لئے کافی ہے۔ چھینکتے چھینکتے ملزم کا دیوالہ نکل جائے بلکہ موت تک صادر ہو جا سکتی ہے۔

حکومت نے "اندولن" والے قیدیوں کو بیکار بند کر رکھا ہے اور انکی ذات پر فضول اتنا روپیہ خرچ کر رہی ہے انکی بہترین سزا تو یہ تھی کہ کسی دوا کے ذریعہ سو ہزار چھینکیں دلوا دی جاتیں پھر دیکھتی حکومت تماشہ۔ زندگی بھر وہ "اندولن" کا نام نہ لیتے بلکہ قسم وفاداری تک کھا لیتے۔ یہاں "گن پاوڈر" سے زیادہ اہمیت ناس کی ہے مگر یہ اہم معاملہ حکومت تک پہنچائے کون؟ اور پھر سرکار اتنی عقلمند ہوتی تو یہ ساری آفتیں ہی کیوں پیدا ہوتیں؟ بدامنی کے ہنگاموں میں تمام آنسو والی گیس استعمال کی گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ بدامنی اور قانون کی خلاف ورزی رک تھوڑی ہی گئی۔ لاہور میں خاکساروں پر گیس استعمال کی گولی برسائی مگر اس سے کیا ہوا

خاکسار تحریک ختم ہو گئی؟ اگر چھینک کی کوئی گیس تیار کی جائے اور ایسے موقعوں پر اسی کا استعمال ہو تو یقین ہے کہ سو فیصدی کامیابی ہوگی۔ پیسوں کی علیحدہ بچت ہے اور کامیابی کی الگ ضمانت اور ایک فائدہ ہو تو کوئی سمجھائے بھی ہزاروں کہاں تک بتائے جائیں

طبیبوں کا خیال ہے کہ چھینک کے قبل چہرے پر ایک خاص کیفیت "مرڈوڑ" کی نمایاں ہوتی ہے۔ آپ کو اس بات میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ "مرڈوڑی" کیفیت خود آپ پر ہزاروں بار گذر چکی ہوگی۔ ذرا غور تو کیجئے کہ چھینک آنے کے قبل آپ کے چہرہ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ کوئی خط بھی اپنی جگہ درست رہتا ہے؟ کہیں زاویۂ قائمہ بنا ہوتا ہے اور کہیں ترنجھ کون اور وہاں اقلیدس کی وہ وہ شکلیں بنتی ہیں جو اقلیدس ایجاد کرنے والے کے خیال میں بھی کبھی نہ آئی ہونگی۔ اب حالت ذرا ترقی کرتی ہے اور اس "ٹوپوگرافی" کے ساتھ آپ کے ناک کی ستم ظریف گدگدی تیز ہوتی ہے اور آپ کے دونوں جبڑے "ابوالہولی" انداز میں ایک دوسرے سے فرقت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ اور عروج اس وقت ہوتا ہے جب پھولی ہوئی ناک، بگڑے ہوئے چہرے اور شمال و جنوب کی انتہائی سرحد پر جمے ہوئے دونوں جبڑوں کے ساتھ

آپ چھینک کا انتظار کرتے ہیں۔ اکثر وہ وفاداری کے ساتھ وقت پر آجاتی ہے اور کبھی بے وفائی پر تلتی ہے تو چہروں کا جغرافیہ بگاڑتی رہتی ہے۔ مگر آنے کا نام نہیں لیتی۔

جنگ کے اختتام پر جب ہٹلر، ٹوجو اور مسولینی قید ہو جائیں گے اور ہیری رائے پر عمل کرکے انھیں چھینکیں دلوائی جائینگی تو کتنا مزہ آئے گا۔ بے چارہ گول مول ٹوجو مارے چھینکوں کے پریشان، بدحال، بےنچر ہوتے ہوئے فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہو گا۔ ہٹلر جو اپنی مونچھوں کے بل بوتے پر دنیا کو اپنے ہتھیاروں کے سایے میں یلاتا تھا اب چھینکوں کے سایے میں نمرود کو یاد کر رہا ہو گا اور پولینڈ و فرانس کی بجائے اس کی ناک میں جو معرکۂ کارزار گرم ہو گا اس سے نجات ناممکن نظر آئے گی۔ اب رہا مسولینی کا معاملہ تو اسکی "عظیم الشان توند" ہزار چھینکوں کے بعد ہی بیچاری "دھیا توند" بن کر رہ جائے گی۔ اور ناک؟ وہ غریب تو پہلے ہی کٹ چکی تھی۔ رہی سہی بھی چھینکوں کی نذر ہو جائے گی۔ تو جناب یہ ہے چھینک جو مونچھ کو چھوڑتی ہے اور نہ توند کو اور اچھے خاصے آدمی کو فٹ بال بنا دیتی ہے۔

چھینک کے آنکھیں تو ہوتی نہیں، جو دیکھ بھال کر اور موقعہ کی نزاکت کا خیال کرکے آئے اگر اس کے آنکھیں ہوتیں تو یہ

کسی چشمہ کمپنی سے اُسے چار آنکھیں لگوا دیتا۔ دیکھئے میں کتنی سنجیدگی سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں مگر "چھینک" اس بات پر تُل گئی ہے کہ میں اسکے متعلق کچھ نہ لکھوں، حملہ شروع ہو چکا ہے اور میں ہنستا اسکا مقابلہ کرنے سے رہا۔ یہی ایک ایسی آفت ہے جس سے مقابلہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں یہ میری تیسری چھینک تو اتنی زور سے آئی جیسے کہہ رہی ہو:

اِک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے

یہ شاید لکھائی بند کرنے کا آخری سگنل تھا۔

دیکھا آپ نے اس "مختصر" سی چھینک کے سامنے ساری "اشرف المخلوقیت" دھری رہ جاتی ہے۔ تو بیچارہ سیٹھ جی کا بس نہ چلا تو کون سی بری بات تھی لیکن لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ ہنس دیتے ہیں +

ستر رنگ

"مُردہ بدست زندہ"

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبّت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جیتے جی کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری ہی دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لئے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی دوستی و محبّت کا یہ دم بھرا جاتا تھا مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔ اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے آیئے میرے ساتھ آیئے آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجئے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں۔ امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ اِن باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے" اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔

یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے، کچھ اُدھر، آگے آگے جنازہ ہے اسکے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے ہونگے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو

معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کردی۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اُٹھانے کی اُجرت پر بلایا گیا تھا۔ اسکے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس سواریاں نہ تھیں یا شرماشرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ اخیر وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہونچ گیا اور ان میں سوار ہوگیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے انکو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کئے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹر کی برائیاں، اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ اس سے پیچھا چھٹا کہ دوسرے صاحب آگئے۔ اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کئے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہونچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے۔ اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو، کپڑے بدل

خاص اسی جنازہ کے لئے آئے ہیں۔ تیسرے وہ جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہونچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار، کبھی موٹر یا کبھی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہوگئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ اِدھر نماز ختم ہوئی اُدھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اِدھر جنازہ نکلا، اُدھر یہ پہونچے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستے والوں کی سنیئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دُکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا مرض دریافت کیا اور واپس ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات وممات ان ہی کے ذمہ تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لئے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔

موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں

کے لئے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گذرنا انکو زہر معلوم ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مگر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے۔ مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آرہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اسکو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کرینگے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہونچ ہی گیا۔

قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے، خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے اس میں ایک سقے صاحب، ان کی بیوی، دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو

توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔ نیم، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصّہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کیسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو پہلے حصّے کا مُردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے انکے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے جن کی زمین ہے وہ تو روپئے کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصّے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لئے دکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپئے گز والی زمین کو کیوں نہ صاف رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں۔ میاں سقّہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے نیچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول

بستر پر رہے صبح باسی پھول لے جا کر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا
ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا مردے بھی خوش ہو گئے
اس گھر میں سل بٹا کبھی خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ قبر کے اچھے
اچھے پتھر پر مسالہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے
نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر
قلانچیں مارتی پھر رہی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں
بچے یا تو چبوترے پر لوٹ رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے
بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس
رہی ہیں۔ کسی بچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اس پر سقنی نے
گیہوں سکھانے کو ڈال دیئے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک
پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے وہ قبروں میں گھاس چرتی
پھرتی ہے۔ اسکے ادھر اُدھر پھُدکنے سے کبھی قبر کی اینٹ
گری، کبھی کا چونا گرا، کبھی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے
چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے دنوں میں وہی منظر بن جائے
جو زلزلے کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں ترم بج گیا۔ سقے کا
سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا۔ اور اناج
لینے کو برتن لے لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں پیندے کا

تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رازق ہے قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیئے۔ جنازہ لاکر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے، کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ اور کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقہ سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیئے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلفہ پر سلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔ بعض لوگ ہیں کہ گھاس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون

ہیں ؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دِن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت سے، چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اسکے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا کچھ اُن کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی دیا۔ جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتروں کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور انکی تصدیق اور تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیئے۔ اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔ خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک

صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میّت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے میٹھے کے سرے پکڑ کر میّت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا۔ "سنبھال کے سنبھال کے۔ میّت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ۔" اب میّت قبر کے منھ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے "ذرا کمر کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پا کھا نہ گرے۔ ہاں ہاں، ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے، آہستہ آہستہ، بس بھئی بس۔" کوئی چیخ رہا ہے۔ "میٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منھ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ، اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منھ پورا نہیں پھرا۔ بس بھئی بس۔"

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بچارے قبر میں اُترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔

بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب اس

مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو۔ کوئی کہتا ہے "لاحول ولا قوۃ مفت سور دیئے مار لئے اور کڑیاں دیں تو ایسی"۔ غرض کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے اور منھ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ "منہا" بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منھ ہی منھ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہونگے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزّہ کون ہیں اور انکی حالت کیا ہے۔ ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آ کر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ "فاصلہ بہت تھا"۔ کبھی کہتے ہیں "آپ کی وجہ سے

دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے یہاں سے دوگنا مل رہا تھا۔" بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کرکے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اسکے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اے اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے ان کے دل میں درد پیدا کر۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں اور ہم کیا کیا کر رہے ہیں۔

مضامین فرحت

"پٹنا"

کہتے ہیں کہ " دیوانہ را ہوئے بس است" اب اس مضمون کی حد تک دیوانہ آپ مجھے فرض کر لیجئے اور "ہو" اس تحریک کو سمجھ لیجئے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے "پٹنے" کے متعلق کی ہے۔ ان کی یہ تحریک پڑھ کر مجھے جوش ہی تو آگیا کہ اپنے کسی "پٹنے" کے واقعہ کو لکھ ڈالوں .... مگر میری بدقسمتی دیکھئے کہ مہینوں تک سوچنے کے بعد بھی کوئی واقعہ یاد نہیں آتا مجھے کیا معلوم تھا کہ مضمون نگاری کے لئے "پٹنے" کی مشق کرنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ یقین مانئے کہ اگر مجھے پہلے سے اسکی اہمیت معلوم ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دو چار واقعات اپنے اوپر ضرور نازل کر لیتا۔ فی زمانتا بھی میں نے بہت کوشش کی کہ خیر جب نہیں پٹے تو اب پٹ جاؤ۔ مضمون تو لکھ لوگے۔ مگر کیا کیا جائے کہ باوجود ایسی کارروائیاں کرنے کے جو ایک بھلے آدمی کے پٹ جانے

کے لئے بالکل کافی ہو سکتی ہیں۔ میری یہ مراد کسی طرح بر نہ آئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ مرزا عظیم بیگ صاحب یا کسی اور مزاحیہ نویس صاحب کو دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لائیں تاکہ ان سے پالی میں ایک ایک دو دو چونچیں ہو جائیں۔ اس کے بعد یقین ہے کہ اگر میرا مضمون پورا ابھی نہ ہوا تو انشاءاللہ ان کا مضمون ضرور کمپلیٹ ہو جائے گا اسلئے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اے مرداں بکوشید تا جامہ زناں نہ پوشید۔

ہاں ایک شرط ہے اور وہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے یعنی یہ کہ جو صاحب اس مضمون کی تلاش میں بہ خرچہ خود یہاں آئیں وہ اپنے نجیب الطرفین ہونے کا باضابطہ رجسٹری شدہ سارٹیفکیٹ لیکر آئیں کیونکہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ سے پٹنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس سرٹیفکیٹ کے ساتھ ہی کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دیا ہوا "اجازت نامہ خودکشی" بھی شریک رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک مرزا جی کے ہاتھ کی مار کسی مارواڑی کی توند تو ہے نہیں کہ آواز تو آئے "دھن" سے اور چوٹ لگے کسی سڑے ہوئے تربوز کی۔

بہر حال جو کوئی آئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئے اور ایسی

شکل میں آئے کہ مرد اور عورت کی بہ آسانی تمیز ہوسکے تاکہ پٹ جانے کی صورت میں یہ نالہ و فریاد بلند نہ ہو کہ "دور ہوئے تو مرد ذات ہوکر" "بیر بانی" پہ ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

عربی کی ایک مثل مشہور ہے کہ کُلُّ شَیْئٍ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگو کسی کام کو اختیار کرنے سے پہلے اسکی اصلیت کو معلوم کر لو۔ اس لئے قبل اسکے کہ میرا چیلنج یا "تہارات" قبول کیا جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ "پٹنے" کی ترتیب اسکی تعریف اور اسکی تاریخ سے ہر کہ و مہ کو آگاہ کردوں تاکہ جس طرح ارکان مذہب کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد انکی ادائی میں مزہ آتا ہے اسی طرح ہر وہ شخص جس پہ "پٹنے کا عمل" ہونے والا ہے بروقت وقوع واقعہ اسے پوری طرح لذت اندوز ہوسکے۔

پس جاننا چاہیئے کہ علم مجبوریات میں یہ ایک ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور قواعد اردو مولفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی رو سے یہ فعل متعدی مجہول یعنی یہ کہ اس فعل کا عمل ہمیشہ بے وقوفوں پہ ہوتا ہے اور یہ صرف اسی قوم اور ملک کے لغات میں پایا جاتا ہے جو کسی زبردست خان کے زیر اثر ہوتا ہے یا ہوتی ہے یا ہوتے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہم خدا کے فضل سے فارسی اور عربی بھی جانتے ہیں لیکن

جہاں تک ہم کو معلوم ہے زبان فارسی میں ایسے معنی دینے والا کوئی مصدر نہیں ہے۔ وہاں اسکے بجائے لفظ "کشتہ شدن" استعمال ہوتا ہے کیونکہ جن ملکوں میں زبان فارسی رائج ہے وہاں ایسا کوئی بے غیرت نہیں ہوتا کہ سر بازار یا زیادہ سے زیادہ دیوار کی آڑ میں پیٹے اور پھر رسالوں میں اپنے پٹنے کی جوانمردی کا غلغلہ بلند کرے وہاں جب پٹنے کی صورت پیش آتی ہے تو دو میں سے ایک "کشتہ شدن" ہو جاتا ہے۔ اب رہی عربی تو بھلا اس زبان میں یہ منحوس لفظ کیوں آنے لگا۔

بہادر عربوں نے اپنے اپنے ہاں ذرا پہلو بدل کر ایک مصدر "ضرب زید عمروا" ایجاد کیا ہے جس کے معنی ہیں کہ "کرے گا کوئی اور پٹے گا وہی"۔ یہ ایک ایسا وسیع المعنی مصدر ہے کہ ہر فاتح قوم نے اسکو اپنی زبان میں لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ہر فاتح قوم کی معمولی سے معمولی غلطی کا خمیازہ مفتوح "قومچہ" کو اٹھانا پڑتا ہے۔

مثلاً میم صاحبہ سے پٹ کر اگر کوئی صاحب اپنا غصہ بذریعہ ولایتی جوتے کے عبداً کسی قلی کے "بین الصلب والترائب" پر اتاریں اور اس طرح وہ نالائق اپنی تلی پھٹ جانے دے۔ تو ایسی صورت میں اس ولایتی جوتے کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ سارا قصور اُس

تلی کا ہے جو ایک ٹھوکر کی بھی تاب نہ لاسکی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مذہب ملک کی عدالت "ضرب زید عمراً وا" کے حاصل مصدر کو پیش نظر رکھ کر یقیناً "ولایتی جوتے اور ملزم" دونوں کو بری کریگی۔
یہ تو ہوئی پٹنے کی ترکیب۔ اب اسکے بعد اسکی تعریف کو لیجئے۔

فلسفہ میں "پٹنا" اس مسئلہ کو کہتے ہیں جس کا صغریٰ جوتی اور کبریٰ لکڑی ہو اور جسکا نتیجہ چاند کی صفائی نکلے خواہ وہ چکنائی کی صورت میں یا بھنڈارہ پھوٹ جانے کی شکل میں۔ سائنس میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ایک جسم کے جوارح کی گردش سے ہوا کا جو تموج پیدا ہو کر دوسرے جسم پر ختم ہو۔ اور اس دوسرے جسم کی رنگت کو مائل بہ سرخی کردے "پٹنا" کہلائے گا۔ طب میں "پٹنے" سے مراد جسم کا وہ ابھار ہے جو مومیائی کھلائے اور ہلدی چونا ملے بغیر دفع نہ ہوسکے۔ معاشرت خانگی میں یہ لفظ بوجہ کثرت استعمال تعریف سے مستثنیٰ ہوگیا ہے۔ اور ارتقائے تہذیب کے لحاظ سے گو اسکی صورتیں بدل جاتی ہیں مگر معنی میں تغیر نہیں ہوتا مثلاً اگر کسی پانسو پانے والے انگریز نما ہندوستانی کی جنٹلمین بیوی بازار سے ایک ہزار کا سامان ایک دم خرید لائیں تو گو تھرڈ کلاس لوگ اسکو "چانا ہونا" کہیں گے لیکن مہذب سوسائیٹی میں ہمیشہ اس واقعہ کا اظہار "پٹ" جانے سے کیا جائے گا۔ بہرحال ہماری

روزمرّہ کی زندگی میں یہ لفظ ایسا عام ہو گیا ہے کہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل، موٹا ہو یا دُبلا، لمبا ہو یا ٹھنگا، کالا ہو یا گورا اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شریفوں میں اس "پٹنے" کے اثرات میاں پر اور رذیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ اور زمانہ موجودہ کی تہذیب میں انھیں مائل بہ سرخی اثرات کو دیکھ کر ان کی شرافت اور رذالت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق لغت کے لئے لازمی ہے کہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی غور کیا جائے کہ اسکی ابتدا کیونکر ہوئی ہے۔ لفظ "پٹنا" میں "نا" تو مصدر کی علامت ہے۔ اب رہ گیا "پِٹ" تو اسکے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ "حرف صوت" ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کسی بیوی کی پھکنی یا دستپناہ میاں کی کمر پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ متمدن انسانوں میں یہ آواز اکثر گھروں سے آیا کرتی تھی۔ اس لئے دوسروں کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی غرض سے اس آواز کو مصدر کی شکل بنانا پڑا تاکہ لفظ "پٹنا" کے کہتے ہی سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں گھر میں پھکنی اور کسی جسم انسانی کا اتصال ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ نے عمومیت کی شکل اختیار کی

اور ایسی "کارروائیوں" کے متعلق جو دو ہستیوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں رونما ہوتی ہیں اُسکا استعمال ہونے لگا۔

اگر اس لفظ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کچھ پٹنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ بچپن میں رونے پر پٹتا ہے لڑکپن میں نہ پڑھنے پر پٹتا ہے۔ جوانی میں شادی کرکے پٹتا ہے۔ بڑھاپے میں دادا، نانا بن کر پٹتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی اس پٹنے کا سلسلہ مختلف وجوہ اور نئی نئی شکلوں میں جاری رہنے والا ہے جہاں تک منقولی شہادت مل سکتی ہے اس سے ثابت ہے کہ پٹنے کی ابتدا ایک بڑے فرشتہ سے ہوئی ہے۔ یعنی سب شاگردوں نے مل کر اپنے استاد کو ٹھونک دیا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ اُستاد جو شاگردوں کو پیٹتے ہیں تو وہ درحقیقت اسی گستاخی کا بدلہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کو مار بیٹھے تو اسکا یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ قابل تعریف ہے کیونکہ ایسا کرنا افعال انسانی سے بڑھ کر فرشتوں کا فعل ہو جاتا ہے چنانچہ اسی لحاظ سے میں بھی ایک فرشتہ بن چکا ہوں۔

میں مڈل میں پڑھتا تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ترقی پاکر دوسری جگہ چلے گئے اور انکی جگہ ایک دوسرے "حضرت" تشریف لائے۔ نام تو انکا برکت رام تھا لیکن مدرسہ میں بلحاظ اپنی "چپکلی"

داڑھی کے "بکرت اللہ" کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ننھی سی داڑھی سے طالب علم کیوں ڈرنے لگے۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوا اور کلاس مکتب بن گئی۔ برابر ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کا کمرہ تھا وہ تھے صاحب بہادر اور بہت کڑوے مزاج کے آدمی۔ دو ایک روز تو ذرا چپ رہے مگر جب اس "ہو حق" کا سلسلہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی گیا تو ایک دن صاحب نے بکرت اللہ صاحب کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ یہ غصے میں بھرے کلاس میں آئے۔ جاتے وقت ایک سوال دے گئے تھے ہم نے حل کر لیا تھا۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ہم نے بنچ سے اٹھ خوشی خوشی جا سلیٹ ان کے سامنے کر دی۔ یہ جلے ہوئے تو تھے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ زور سے ایک "لپیٹر" رسید کیا۔ ہم روز اول سے استادوں کو مارنا سیکھے ہوئے تھے۔ ادھر انھوں نے ہمکو لپڑایا اور ادھر مسٹر "بکرت اللہ" کے پیٹ میں اس زور سے مکا پڑا کہ بیچارے پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ یہ کچھ نہ پوچھو کہ اسکے بعد کیا ہوا۔ دریافت ہوئی، شہادتیں لی گئیں اور جو فیصلہ آسمان پر ہوا وہی زمین پر ہوا۔ یعنی فرشتے اپنی جگہ پر رہے اور ان کے استاد نکالے گئے۔ خیر یہ تو ایک واقعہ معترضہ تھا اب اصلی بحث کو لیجیے۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میاں بیوی میں اس "پٹنے پٹانے" کا

آغاز کب سے ہوا۔ نسل انسانی کے ابتدائی جوڑے کے خانگی تعلقات
کے متعلق کوئی صحیح روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن یہ ضرور ہے
کہ بعض اوقات ایسے پیش آتے ہیں کہ شریف سے شریف
انسانوں میں بھی اس پر خانہ جنگی ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ سب
سے بڑا جھگڑے کا جھونپڑا تو وہی جنت والا معاملہ تھا۔ آپ خود
ہی غور کیجئے کہ کسی میاں کے رزق کا دروازہ اگر محض بیوی کی غلطی
سے بند ہو جائے تو ان حضرت کو کیا کچھ تاؤ نہ آئے گا اور فطرت
انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اس تاؤ کا نتیجہ کیا کچھ نہ نکلے گا۔
جھگڑے کے دوسرے مواقع انکے ہاں اولاد پیدا ہونے کے بعد سے
پیش آنے لازمی تھے اور ضرور پیش ہوئے ہونگے۔ کیا ہمارا مشاہدہ
نہیں ہے کہ جب گھر میں دو بچے ہوتے ہیں وہاں جس بچے کو میاں
چاہتے ہیں اسکو بیوی نہیں چاہتی اور جسکو بیوی چاہتی ہے اسکو
میاں نہیں چاہتے۔ اور یہی اختلاف "جاہلیت" اکثر خطرناک
صورتیں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر بھلا جس گھر میں دن کو ایک اور رات
کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہوگا وہاں اراکین خاندان مشترکہ میں کیا کچھ
"اختلاف" نہ ہو گیا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس مادہ میں کوئی عینی شہادت
نہیں ہے اس لئے اس پر عقل آرائی کرنی اور قیاس سے کام لینا
اصول روایت کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ

خانہ جنگی کا تخم ہماری فطرت میں ابتدا ہی سے بویا گیا ہے اور ثابت بھی یہ ہے کہ گھر میں اگر اس قسم کی دانتا کلکل نہ ہوئی تو وہ گھر "کا ہے" کو ہوا قبر ہو گیا۔

اس کے بعد سے "پٹنے" کے متعلق تاریخی شہادت برابر ملتی چلی جاتی ہے چنانچہ اس بارے میں پہلا تاریخی واقعہ ہابیل اور قابیل کا جھگڑا ہے یہ تو معلوم نہیں کیا ہوا۔ جھگڑے کی وجہ کیا تھی اور عموماً جھگڑے کی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی۔ اور اگر معلوم ہوتی بھی ہے تو وہ اکثر غلط ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مصدر عالم وجود میں آگیا۔ اسکے بعد کے واقعات اگر معلوم کرنے ہوں اور اس مصدر کے مشتقات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ عالم مولفہ مولوی فطرت اور مسٹر ضرورت۔

اس قدر سننے اور سمجھنے کے بعد ہے کوئی باہمت جو میرے سامنے میدان میں آئے اور نعرہ لگائے کہ

منم ونت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

(خاص سرپنچ کی برسی کے لئے لکھا گیا)

آنریری مجسٹریٹ

اب یوں کہنے کو تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، جوائنٹ مجسٹریٹ، اسپیشل مجسٹریٹ۔ ڈپٹی مجسٹریٹ، سب مجسٹریٹ ہی کہلاتے ہیں مگر آنریری مجسٹریٹ والی بات ان بچاروں کو کہاں نصیب۔ اور سچ پوچھئے تو یہ بات وہ چاہیں بھی تو ان میں آنہیں سکتی، اسلیئے کہ یہ لوگ ٹھہرے تنخواہ دار ملازم۔ اب آپ ایک نوکر پیشہ مجسٹریٹ کو ایک اعزازی مجسٹریٹ کے سامنے لاکھڑا کر دیجیئے گا تو آنریری مجسٹریٹ کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟ اُن غریبوں کو صرف اپنی ڈیوٹی ادا کرنے اور تنخواہ پانے سے کام۔ اور یہاں چار بھلے آدمیوں میں عزت و آبرو پیدا کرنے کے سوا اور کوئی خیال نہیں۔

اس کو ہم مانتے ہیں کہ آنریری مجسٹریٹ ہی کی طرح یہ ملازمت پیشہ والے مجسٹریٹ بھی ایک قسم کے حاکم ہیں۔ مگر یہ چیز ہی اور ہے، اس سے اسکو کیا نسبت۔ وہاں بات بات پر

جواب دہی اور قانونی باز پرس ۔ اور یہاں کسی بات کی پابندی ہی نہیں، ایک دم مطلق العنانی۔ وہاں تیس دن کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہئے اور یہاں کبھی کبھار ہفتہ دو ہفتہ میں اجلاس پر جاکر مجسٹریٹی کی شان دِکھلا دی اور بس۔ وہاں کلکٹر کی جھڑپ۔ کمشنر کی ڈانٹ۔ جج کے ریمارک کا ہر وقت خوف اور یہاں کلکٹر صاحب کے سوا کسی کی کیا مجال کہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ ان تھرڈ کلاسی مجسٹریٹوں کو چھوڑیئے آپ کسی فرسٹ کلاس کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی سے بھڑا لیجئے۔ توبہ کیجئے، کیا واسطہ! یہ بھی کوئی مجسٹریٹی ہوئی کہ صبح اُدھر ہوئی نہیں اور بستوں کا پلندہ دستخط کرنے کے لئے سامنے لاکر رکھ دیا گیا اور بقلم خاص شروع ہو گیا۔ غریب مجسٹریٹ کیا ہوا کہ دستخط کرنے کی مشین۔ ادھر گیارہ بجے جلد جلد ٹفنایا اور پہنچ گئے کچہری۔ وہاں بھی پھر وہی دستخط بازی اس سے فرصت ملی تو اب مقدمہ کی سماعت شروع ہو گئی۔ چار بجے تک وکیلوں کے قانونی ردو قدح، بیرسٹروں کی بحثا بحثی میں سر کھپاتے رہے۔ اجلاس سے بدحواس کوٹھی پر پہنچے، غسل کر کے چائے کی پیالی پوری ختم بھی نہ کرنے پائے کہ کوتوالی سے کسی نے فون کیا کہ ہڑبونگیوں نے بہت بڑا جلوس نکالا ہے۔ فوراً آرڈی ننس کا احترام کرانے کے لئے دوڑے کوتوالی۔ ہو ہڑپ

ادھر ادھر پکڑ سے جلوس منتشر کرنے کے بعد پھر اپنے بنگلہ پر پہنچے۔
کلب جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ایک دیہات میں بہت بڑے
بلوے کے احتمال کا تار پہنچا۔ جس میں فوری امداد کی استدعا تھی۔
فوراً ایس پی اور ایک لاری ملٹری کو ساتھ لئے جائے وقوعہ پر روانہ
ہوگئے۔ وہاں پہنچکر ہوائی فیر سے رعب جمانے اور ایک دو گھنٹہ رہ کر
سب انتظام درست کرنے کے بعد راتوں رات وہاں سے واپس
ہوکر صبح ہوتے ہوتے پھر اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ غسل اور چائے سے
فرصت کر کے تھوڑی دیر مسہری پر آرام کرنے کے خیال سے
لیٹے ہی تھے کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے فون کیا کہ آرڈی ننس شکنوں
نے جیل کے احکام کی خلاف ورزی اور جیل کے اندر ہڑ بونگ
شروع کردی ہے۔ نیند سے بدحواس اور تکان سے چور ولے برانڈش
اسی حالت میں شاہی مہمانوں کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ ڈانٹ
ڈپٹ، سمجھا بجھا کر کوٹھی پر جب واپس آئے تو دیکھا کہ خواہ مخواہ
سلام بجانے والوں کی اچھی خاصی تعداد دق کرنے کے لئے
برآمدہ میں موجود ہے۔ بغیر سلام لئے اور غصہ میں ان لوگوں سے
منھ پھیرے آفس روم میں پہنچے۔ پھر وہی دستخط مشق کرنے
والی وصلیوں یعنی فائل کا ڈھیر میز پر موجود۔ یہ ہے ڈسٹرکٹ
مجسٹریٹی۔ نہ اطمینان سے کھانا میسر۔ نہ چین سے سونا نصیب اور

اسکا آپ چلے ہیں آنزیری مجسٹریٹی سے مقابلہ کرنے۔ جس میں نہ
کوئی کام نہ دھندا۔ نہ کوئی ذمہ داری نہ اسکا احساس۔ بلا دردِ سر
مفت میں مجسٹریٹ بنے شان سے بیٹھے ہیں۔

وہ تو خدا کو اچھا کرنا تھا کہ بچپن ہی سے انگریزی تعلیم کے
بکھیڑے سے ہم الگ رہے ورنہ خدانخواستہ کہیں گریجویٹ ہو جاتے
تو کلکٹر صاحب، خدا ان کو تا حیات زندہ رکھے، جس مہربانی کی نظر
رکھتے ہیں اور اپنے عزیز خانساماں سے کسی طرح کم نہیں ملنتے یقینی
ڈپٹی نہیں تو سب ڈپٹیوں میں ضرور بھرتی کرا دیتے۔ اور یہ آج
جو خدا نے آنریری مجسٹریٹی کے ہائی پوزیشن پر پہنچا دیا ہے ہمیشہ
کے لئے اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہ جاتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ
شکر اور کلکٹر صاحب کا ہزار ہزار احسان کہ ہم جیسے خاکسار۔ ذرۂ
بے مقدار۔ گناہگار۔ سیاہ کار۔ بداطوار و بدکردار کو اتنا بڑا درجہ
عطا فرما کر صاحب اختیار والا اقتدار بنا دیا۔ (یاد رہے کہ انکسارًا
اور قافیہ کی وجہ سے بھی بعض الفاظ ہماری زبان سے نکل
گئے جس کو آپ سچ مچ نہ سمجھ جائیں ؎

اگر ہووے اس کے کرم کی نگاہ
گدا کو بنا دے ابھی بادشاہ

(بعض پرانے نسخوں میں گدا کے الف میں ہائے ہوز بھی لپٹی ہوئی ہے)

لیکن جناب! یہ اعزازی عہدہ جیسی قابلِ رشک، عزت کی چیز ہے اسی قدر اسکا حصول دقت طلب اور دشوار بھی ہے۔

یہ ڈپٹی مجسٹریٹی کی طرح آسان نہیں کہ صرف گریجویٹ ہو گئے اور دو چار مہینے دوڑ دھوپ کر دس بیس سارٹیفکیٹ حاصل کر لئے اور کچھ دنوں بڑے بڑے حکام اور بااثر لوگوں کی آستان بوسی اور منت و خوشامد کر کے، سعی و سفارش پہنچا کر کلکٹر صاحب کے یہاں سے امیدواروں میں نام بھجوا دیا۔ اس کے بعد کمشنر اور انتخابی بورڈ کے ممبروں کی کوٹھیوں کے چکر لگانے میں کچھ وقت صرف کیا۔ غرض چھ سات ماہ کی خاک بسری اور بڑے بڑے لوگوں کی آستان بوسی وغیرہ کے بعد اگر قسمت نے یاوری کی تو آدمی سے ڈپٹی مجسٹریٹ بن گئے۔ ورنہ پھر آئندہ سال کوٹھیوں اور بنگلوں کا طواف شروع کر دیا۔ اگر دوسرے سال بھی قسمت آزمائی بے نتیجہ رہی تو زیادہ سے زیادہ اور دو ایک سال دوڑ دھوپ کے بعد کامیاب، یا اُوور ایج (OVERAGE) ہو کر اطمینان سے بیٹھ رہے۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ آنریری مجسٹریٹی کے امیدواروں کی طرح دس دس پندرہ پندرہ برس تک صبر آزما انتظار تو نہیں کرنا پڑتا۔ پھر اس زمانہ امیدواری میں مسلسل ہر ہفتہ صاحب کے یہاں کی بلاناغہ حاضری افسرانِ اعلیٰ کی خوشامد۔ کبھی کبھی حکام کی دعوت۔ ڈریسوں کا نذرانہ

سرکاری فنڈ میں چندہ دینا اور دلوانا اور ساتھ ہی اسکے سی آئی ڈی کی آنریری ڈیوٹی ادا کرنا۔ ان فدیانہ خدمات کے علاوہ سب سے بڑھ کر جو مشکل چیز ہے وہ تحمل و برداشت و بے نفسی کی آزمائش جس میں بڑے بڑے نیاز مندوں کے پاؤں بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

چنانچہ خود ہمارے ساتھ اتفاقی طور سے ایک ایسے امتحان کا موقعہ پیش آگیا جس کے باعث قریب تھا کہ ہم راہِ طلب سے بھٹک جائیں وہ تو خدا نے بڑا فضل کیا کہ اس سخت آزمائش میں بھی ہم ثابت قدم رہے ورنہ غیرت و خودداری کے جذبہ نے تو سارا کام ہی بگاڑ دیا تھا۔ چونکہ آنریری مجسٹریٹی کے مستقل عہدہ پر بحال ہو چکے ہیں اسلئے اب اسکے کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ قصّہ یوں ہے کہ حسب معمول ایک روز سلام بجا آوری کی ڈیوٹی ادا کرنے کے لئے کوٹھی پر حاضر ہوئے، اب ہمیں کیا معلوم کہ میم صاحب نے ڈانٹ بتائی ہے اور صاحب اس وقت عتاب زدہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے جیوں ہی کوٹھی کے سائبان میں قدم رکھا نظر پڑتے ہی صاحب نے غرّا کر چپراسی کو بلایا، خدا جانے اس سے کیا کہا کہ غریب کو ہمیں کوٹھی کے احاطہ سے باہر تک عزت و آبرو کے ساتھ پہنچانا پڑا۔ چپراسیوں کو انعام دیتے رہنے کا فائدہ اس روز معلوم ہوا۔ اب اسکو غیرت کا تقاضا کہئے یا اپنے دل کی کمزوری کہ اس

خلاف امید واقعہ کا فوری طور پر ہم پر ایسا اثر پڑا کہ تھوڑی دیر تک ہم عزت کی زندگی اور ذلت کی موت جیسے نازک مسئلہ پر غور کرنے لگے وہ تو خیریت ہوئی کہ اس جگہ سوائے چپراسی کے کوئی اور دوسرا موجود نہ تھا ورنہ اس خبر کے پھیل جانے سے عوام کی نظروں میں ہمارا پوزیشن ذرا نازک ہو جاتا۔ بات اصل یہ ہے کہ بے عزتی اور توہین اس وقت زیادہ ناقابل برداشت چیز ہو جاتی ہے جب دوسرے لوگ بھی جان جائیں۔ ورنہ "ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا" والا مضمون ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارا واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہو کر رہ گیا۔ اور ایک ہمارے ساتھ کیا بہت سے فرسٹ، سکنڈ پاور والوں کے ساتھ بعض وقت اپنے اعلیٰ افسروں کی کوٹھیوں پر ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو کسی کے نہ جاننے کی وجہ سے توہین کے تحت میں آ ہی نہیں سکتے۔

تو خلاصہ گذارش فدوی یہ ہے کہ اس اعزازی عہدہ کے حصول میں اکثر اس طرح کے ہمت شکن حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر طلب صادق ہے تو نہایت ہی عقیدت مندانہ استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ آدمی اسکا خیر مقدم کرتا ہے چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صاحب نے آنریری مجسٹریٹی کے لئے ہمارا نام زوردار سفارش کے ساتھ بھیج دیا۔ اور قبل اسکے کہ ہمارا نام گزٹ میں نکلے

اور آنریری مجسٹریٹی کا ڈبل یا سنگل پاور ملے جب تک یہ زرو پاور کا حاکم یعنی اسیسر بنا دیا۔ اسکے تھوڑے ہی دنوں کے بعد خدا کے فضل، کلکٹر صاحب کی مہربانی اور دوستوں کی دعا سے یہ غلام کفش بردار حکام آستانہ بوسی افسران عالی مقام آنریری مجسٹریٹی کے عہدہ جلیلہ پر فائز المرام ہو گیا۔

پہلے پہل جس روز ہم اپنے برابر کے شریک کار آنریری مجسٹریٹ کے ہمراہ اپنے اجلاس پر پہنچے، چپراسی، پیشکار، مدعی، مدعا علیہ گواہان اور مختار صاحبان نے تعظیماً کھڑے ہو کر جیسے فدویانہ انداز سے سلام کیا اسکا لطف کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ہم دونوں بھی ہائیکورٹ کے ججوں کی طرح حاکمانہ انداز میں سر کے اشارہ سے جواب سلام دیتے ہوئے اپنی کرسی عدالت پر رونق افروز ہو گئے۔ اردلی کا باضابطہ وردی میں سامنے کھڑا رہنا، مدعی کا دست بستہ دہائی دینا۔ مدعا علیہ کا رحم طلب نگاہوں سے دیکھنا۔ فریقین کے مختاروں کا "حضور عالی! غریب پرور" بار بار دہرانا ایسا سرور بخش، روح پرور سماں تھا کہ ہمارا تو خیال ہے کہ اور تو اور گاندھی جی بھی ایک بار اگر اس روحانی لذت سے آشنا ہو جائیں تو گول میز کانفرنس یا آشرم

یا جیل جہاں کہیں گئے ہوں وہاں سے فوراً پہنچکر اس خود اختیاری حکومت پر قبضہ کرکے نہایت ہی ٹھاٹھ کے ساتھ لنگوٹی باندھے ہوئے آنریری مجسٹریٹی شروع کردیں۔ ہماری بات مانی جائے تو گورنمنٹ کو یہ خیر خواہانہ مشورہ دینگے کہ کہاں مصالحت وغیرہ کے پھیر میں پڑی ہے گاندھی جی کو صرف آنریری مجسٹریٹی دے دے پھر دیکھے کہ خود بخود کیسے وفادار جی حضوری بن جاتے ہیں کیونکہ مجسٹریٹی ایک ایسا مفرح قلب و دماغ اور مقوی اعضائے رئیسہ و خبیثہ و مصلح خیالات فاسدہ ٹانک ہے کہ صرف ایک بار کے استعمال سے سارے جراثیم سرکش ہمیشہ کے لئے نابود ہوجاتے ہیں۔ گاندھی جی کو بھی ہم یہی صلاح دینگے کہ فضول لیڈری کی خاطر گورنمنٹ کو دق اور پبلک کو پریشان کررہے ہیں۔ لیڈری میں اور ہم تو کہتے ہیں سوراج میں بھی آنریری مجسٹریٹی سے زیادہ تھوڑا ہی مطلق العنانی ہے۔ سوراج کے متعلق تو بالفعل ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر آنریری مجسٹریٹی کا تو ہمیں ذاتی تجربہ ہے کہ قانون کے اندر یا باہر جس کو چاہیے سزا دیجیے، جرمانہ کیجیے، قصور معاف کردیجیے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ایک دم سولہ آنہ سوراج۔

گورنمنٹ نے ادنیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار تک کو جتنے اختیارات

دیئے ہیں سب کے ساتھ قانونی واقفیت کی بھی بیخ لگادی ہے داروغہ سے لے کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تک کے لئے قانونی واقفیت لازمی لیکن ازراہ بندہ نوازی صرف آنریری مجسٹریٹ کو اس سے ایکزمٹ (مستثنیٰ) رکھا۔ بلکہ ہم ہی نمک خواروں کے خیال سے گورنمنٹ نے آنریری مجسٹریٹی کے لئے قانونی ناواقفیت کو کوالی فیکیشن قرار دے کر بیرسٹر و وکلا یعنی قانونی واقفیت رکھنے والوں کو ڈس کوالیفائڈ (ناقابل) کردیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنریری مجسٹریٹی کے اجلاس پر ہم جیسے تعلیمی الجھنوں سے دور رہنے والے نیاز مندوں کی صورت دیکھنے کو لوگ ترستے۔ اور ہم تو سمجھے کہ ایک دم اور کھٹائی میں پڑ جاتے۔ یہ سب سہی لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ اگر قانونی واقفیت ہمیں نہیں ہے تو وکلا اور مختاروں کے سمجھانے سے کچھ زیادہ ہی سمجھ جاتے ہیں اور اپنی طباعی سے ہم خود ہی قانون کے وہ وہ نکات پیدا کر لیتے ہیں کہ جسکے باعث مختاروں کا ناک میں دم رہتا ہے اور وکلا تو اور بدحواس رہتے ہیں۔

چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ سڑک پر استنجا کرنے کا ایک مقدمہ ہمارے اجلاس میں پیش ہوا۔ مدعا علیہ کے مختار نے بحث شروع کی۔ حضور عالی! فرد جرم لگانے کے پہلے جرم کا موٹیو (MOTIVE) اور مدعا علیہ کی نیت کو دیکھنا ضروری ہے۔

فریق نے یہ نہیں ثابت کیا کہ اس جرم کا موٹو سڑک کو نقصان پہنچانا تھا اور نہ اسکی کوئی شہادت پیش کی گئی کہ راہ گیروں کی نگاہ غلط انداز سے بھی انکی شرم و حیا کو صدمہ پہنچا اور نہ اسکا ثبوت ہے کہ یہ فعل عمداً کیا گیا یا مدعا علیہ جائے وقوع پر اسی نیت سے گیا۔ ان میں سے کسی بات کا ثبوت مسل میں موجود نہیں۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ مدعا علیہ سلسل البول یا ذیابیطس یا مثانہ کی کمزوری کے باعث ضبط نفسی پر قادر نہ رہ سکا اور مجبوراً تقاطر نے موسلا دھار کی صورت اختیار کرلی ہو۔ جسکے باعث سڑک پر یہ تھوڑی سی آب پاشی اضطراراً ہو گئی۔ حضور پر خوب روشن ہے کہ اہل رقت سے ضبط کے باوجود آنسو تک تو رکتا ہی نہیں اور یہ تو استنجا کا معاملہ ہے اور پھر حضور نے بڑی بڑی خطائیں معاف کردی ہیں یہ پیشاب خطا ہونا تو کوئی ایسی بڑی خطا بھی نہیں۔ اب حضور کے ہاتھ میں ہے۔ چھوڑنے نہ چھوڑنے کا پورا اختیار ہے۔ یہ قانونی اور مدلل بحث سن کر ہم نے اپنی ذہانت سے مختار صاحب کو ایسا قائل کردیا کہ وہ بھی سمجھتے ہونگے کہ کوئی آنریری مجسٹریٹ ہے۔ ہم نے کہا کہ مختار صاحب! بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ایک بار دو بار کا قصہ ہو تو معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ کئی دفعہ آپ کے موکل نے یہی حرکت کی ہے۔ مختار صاحب نے جلدی سے کہا کہ حضور یہ پہلا

قصور ہے ایک دفعہ سے دوسری دفعہ ثابت ہو جائے تو جو سزا چاہیں حضور دیں۔ ہم نے کہا کہ کم از کم چونتیس دفعہ تو پولیس کی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے اور اس کو آپ بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ یہ سن کر مختار صاحب چپ ہی تو ہو گئے۔ دبے لفظوں میں صرف یہ کہا کہ اب میرے موکل کا خدا ہی حافظ ہے۔

ایک روز کا اور ذکر ہے کہ دفعہ ۱۴۷ میں بلوہ کا ایک مقدمہ ہمارے سامنے پیش ہوا اور ایک وکیل صاحب اس دفعہ کا منشا سمجھانے میں قانونی قابلیت کا لگے اظہار کرنے۔ ان کی ضد پر دوسرے روز ایک وکیل دوست کے یہاں ہم نے قانون کی کتاب منگوائی اور دفعہ ۱۴۷ پڑھوا کر اچھی طرح سمجھ لیا اور اس صفحہ پر نشان لگا کر اپنے ساتھ لئے ہوئے اجلاس پر پہنچے۔ وکیل صاحب کی بحث کے بعد ہم نے حسب ذیل فیصلہ لکھا:۔

"چونکہ اس دفعہ کو نابالغ یا پاگل لوگوں سے تعلق ہے اور ایسے لوگ قابل معافی ہیں اسلئے مقدمہ ڈسمس"

وکیل صاحب یہ فیصلہ پڑھ کر بوکھلا گئے اور کہنے لگے دفعہ ۱۴۷ بلوہ کے مقدمہ میں یہ نابالغ اور پاگل کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ہم نے حاکمانہ انداز سے تیور بدل کر قانون والی کتاب جو نشان دیکر

ساتھ لائے تھے کھول کر انکے سامنے رکھ دیا۔ اب جو دفعہ ۳۴۷ میں یہی مضمون صاف لکھا ہوا انھوں نے پڑھا تو مخبوط ہو کر لگے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے۔ ہم نے فاتحانہ انداز سے مسکرا کر کہا کہ آپ لوگ کتاب پڑھ کر تو آتے نہیں اور مفت میں موکل کا روپیہ اور حاکم کا وقت برباد کرتے ہیں۔ یہ جملہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ وکیل صاحب نے تمسخر انگیز انداز سے ہنسکر کہا کہ حضور عالی یہ کتاب سول پروسیجر کوڈ ہے۔ اس دفعہ ۳۴۷ کو تعلق دیوانی عدالت سے ہے۔ اور آپ کی زیر تجویز فوجداری کا دفعہ ۳۴۷ ہے یہ سُنکر پہلے تو ہم ذرا جھینپ سے گئے مگر اپنی بات کی پیچ رکھنے کے لئے "حاکم ہارے منھ پر مارے" کے اصول پر بگڑ کر کہا کہ عدالت دیوانی ہو یا پاگل ہمکو اس سے بحث نہیں، یہ بھی تو آخر سرکار ہی کا قانون ہے، کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں اور اسکے علاوہ قانوناً فیصلہ صادر ہونے کے بعد کوئی عذر قابل سماعت نہیں لہذا مقدمہ سسس پنڈ نہیں بلکہ ایک دم ڈسمس۔

اسی طرح ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم اجلاس پر آنریری مجسٹریٹی کر رہے تھے کہ بے شان وگمان ہیٹ سوٹ پہنے ایک صاحب بہادر ہمارے اجلاس پر پہنچ گئے۔ یہ سمجھ کر کہ کوئی افسر اعلیٰ ملاحظہ کے لئے تشریف لائے ہیں۔ نظر پڑتے ہی ہم اور ہمارے ساتھی دونوں گھبرا کر

تعظیماً کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باضابطہ فوجی سلام بجا لائے لیکن جب ایک مختار صاحب نے یہ کہکر تعارف کرایا کہ آپ حال ہی میں انگلینڈ سے بیرسٹری پاس کر کے آئے ہیں اور حضور کے اجلاس میں ایک موکل کی طرف سے کام کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں تو فوراً کرسی پر ہم بیٹھ گئے۔ اور اس غلطی کی تلافی کے خیال سے حاکمانہ انداز سے کہدیا۔ اول رائٹ یس گو آن۔ اب تازہ وارد بیرسٹر صاحب اپنی بیرسٹری کے زعم میں یا یہ سمجھ کر کہ عدالت انگریزی زبان جانتی ہے۔ صاحبی زبان میں مقدمہ سمجھانے لگے۔ ہم عجب مشکل میں پڑ گئے کہ اگر صاف صاف کہدیں کہ ہم دونوں انگریزی نہیں جانتے تو یہ ذرا حاکمانہ شان کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔ اور اگر اسی طرح انکو انگریزی میں بولنے کے لئے چھوڑ دیں تو ایک حرف سمجھ میں نہیں آتا مگر یہ سوچکر کہ یہاں سمجھنے اور نہ سمجھنے پر تھوڑا ہی فیصلہ موقوف ہے انگریزی نہ جاننے کا حال کہکر کیوں پردہ دری کی جائے۔ اور پھر ایک دم ایسے بھی نہیں جو کچھ سمجھ نہ سکیں۔ خدا اگر جھوٹ نہ بلوائے تو بیسیوں انگریزی الفاظ کے معنی ہم جانتے ہیں۔ مجسٹریٹ۔ کورٹ آرڈر۔ چیف کراس۔ فائن وغیرہ وغیرہ اس قسم کے اور بھی الفاظ یاد ہیں۔ چنانچہ بیرسٹر صاحب کی تقریر کے الفاظ یور اونر، مائی کلائنٹ، نوبیروقت یہ سب ہم سمجھ ہی رہے تھے۔ بولتے بولتے

وہ ایک جملہ یہ بول گئے "آئی اپیل ٹو یور جسٹس" ہم سمجھ گئے کہ یہ حضرت جسٹس کے یہاں اپیل کی دھمکی دے رہے ہیں۔ دل میں کہا کوئی پروا نہیں۔ جسٹس، چیف جسٹس یا پریوی کونسل ہی میں اپیل کر کے ہمارا کیا بگاڑ لینگے۔

تنخواہ یا بھتہ ہم تھوڑے ہی پاتے ہیں جو ان باتوں سے ڈر جائیں۔ جرمانہ ٹھونک ٹھونک کے ہم سرکار کو اس قدر روپیہ دلاتے ہیں اس میں سے کچھ کمیشن ملتا تو جانتے کہ ہاں اک رقم ہے اس دھمکی پر آگیا ہمیں غصہ ہم نے کہا کہ جناب بیرسٹر صاحب یہ کسی ڈپٹی وغیرہ کا اجلاس نہیں ہے کہ قانون اور بحث سے قائل کر کے آپ مقدمہ جیت جائیں۔ قانون وغیرہ تو یہاں رہنے دیجئے باقی رہی بحث تو آج تک بحث سے بھی کوئی بات طے ہوئی ہے مذہبی جھگڑے تو بحث مباحثہ سے طے نہیں پاتے اور یہ تو مقدمہ ہے۔ یہ سنکر ایک مختار صاحب نے جو انکے ساتھ تھے ہمارا تیور دیکھ کر بیرسٹر صاحب کو تو بیٹھنے کے لئے کہا اور انکی اجازت سے خود بحث شروع کر دی۔ مختار صاحب نہایت ہی موقعہ شناس تھے۔ ان کی بحث ہمیں بہت پسند آئی۔ انھوں نے کہا حضور کی قابلیت، ذہانت اور قانونی واقفیت کے سامنے کس کی مجال ہے کہ لب کشائی کر سکے۔ حضور عالی کا ہر ہر لفظ خود ایک قانون ہے

ہمارے موکل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسے حاکم کے یہاں مقدمہ آیا ہے جس کی عدل گستری اور انصاف پروری کی دھوم ہے۔ جب تو سرکار نے بھی اتنا بڑا درجہ دیا ہے کہ جسکی جو سزا چاہیں دیں یا چھوڑ دیں۔ ہمیں اپنے موکل کی بے گناہی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور خود روشن ضمیر ہیں۔ آپ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ ہمارے موکل کی جاں بخشی حضور کے ہاتھ میں ہے۔ حضور جان و مال کے مالک و مختار ہیں۔" یہاں تک کہ بحث کے آخر میں اوپر خدا اور نیچے ہم ہی دونوں مجسٹریٹ رہ گئے۔ ہم نے بیرسٹر صاحب سے کہا کہ دیکھا آپ نے؟ اس کو بحث کہتے ہیں کہ پتھر کا بھی حاکم ہو تو موم کی ناک ہو جائے۔

ایک مقدمہ کا حال اور سُن لیجئے! چند شخصوں پر دفعہ ۱۴۳ مجمع ناجائز۔۔۔۔۔۔ اور دفعہ ۱۶۰ اسٹرک پر لڑائی جھگڑا کرنے کے دو جرموں میں دو دفعات قائم کر کے مقدمہ چلایا گیا تھا۔ ہم نے مدعا علیہ کے مختار سے کہا کہ دو دو دفعات کے اظہار، جرح اور بحث میں بہت طول ہو گا اسلئے ہماری رائے ہے کہ ایک ہی دفعہ قائم کر کے مقدمہ تجویز کیا جائے تو آپ کو بھی آسانی ہو گی اور عدالت کا بھی وقت بچے گا۔ مختار صاحب نے پہلے تو بہت خوش ہو کر ہماری

عاقلانہ تجویز کی بڑی تعریف کی۔ لیکن جب ہم دفعات ۱۴۳۔ اور ۱۶۰ دونوں کو جوڑ کر ۳۰۳ کا ایک ہی دفعہ قائم کرنے لگے تو لگے مختار صاحب شور کرنے کہ حضور کیا غضب کر رہے ہیں یہ تو خون کا دفعہ ہے۔ ہم نے کہا تو کیا حرج ہے۔ فیصلہ تو ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اور یوں اگر آپ کہئے تو آپ کے خیال سے رعایتہً اسی دفعہ میں اور کچھ گھٹا دیں اور بجائے دفعہ ۳۰۳ کے ۳۰۲ بنا دیں۔ اس پر انھوں نے اور ہنگامہ شروع کر دیا کہ یہ تو اس سے بھی بڑھ کر قتل در قتل ہو جائے گا۔ ان دفعات کے مقدمات کا آنریری مجسٹریٹ کیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھی تجویز کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ سیشن کیس ہے۔ جج کے سوا کوئی دوسرا حاکم اسکی سماعت کر ہی نہیں سکتا۔ ہم نے کہا کوئی پرواکی بات نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ہم اسیسر بھی ہیں۔ بیسوں سیشن کی سماعت ہم نے کی ہے مختار صاحب تو صدائے احتجاج بلند ہی کر رہے تھے۔ کورٹ انسپکٹر انکے فریق نے بھی اس معاملہ میں انھیں کا ساتھ دے دیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ دونوں آپس میں مل گئے ہیں۔ اسی غصہ میں ہم نے اس کیس کو ڈسمس کر دیا۔ ہم عموماً ایسے مقدمات جس میں اس طرح کی قانونی پیچیدگیاں ہوتی ہیں اکثر اس خیال سے ڈسمس کر دیا کرتے ہیں کہ کون اس قانونی جھنجھٹ میں پڑے۔ ہمیں لینا ایک نہ دینا دو نہ تنخواہ کی لالچ نہ بھتہ کی امید۔ پھر خواہ مخواہ کی دردسری کیوں

مول لیں اور یوں کسی نے ہمارے اجلاس سے مقدمہ جیتنے کی خوشی بین فیصلہ کے قبل ہی محض دوستانہ پیشگی مٹھائی کھلادی یا نقدی دعوت کردی تو اسکو قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ باقی رہی عزت تو گزٹ میں نام چھپ جانے کے بعد کون شریف آدمی آنریری مجسٹریٹ کے اعلیٰ پوزیشن سے انکار کرسکتا ہے۔ ہم ان ناقدر دانوں کو نہیں کہتے جو اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہنے کے باعث رشک سے ہمیں خوشامدی ٹٹو کہتے ہیں اور بعض حاسد تو بغض و حسد سے جل کر ہمارے منھ پر بھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ تو ایک دم وہ ہیں۔ یعنی ایک نیک بخت، بے ضرر جفاکش، منکسر مزاج جانور کے اوصاف سے ہمیں متصف کرتے ہیں ایک آنریری مجسٹریٹ کی شان میں یہ گستاخی سنکر کبھی کبھی غصہ میں ہمارا جی تو چاہتا ہے کہ اپنے ہی اجلاس میں ان پر توہین عدالت کا مقدمہ دائر کر کے ان سب کو غلط گوئی الزام میں پھنسا دیں۔ کیونکہ ہمارے ملنے والے سب جانتے ہیں کہ ہم لاکھ سادہ لوح سہی مگر ایک دم وہ نہیں ہیں۔ خیر ان رشک کرنے والوں کی باتوں کی ہمیں پرواہ نہیں۔ یہ کچھ بھی کہیں مگر سمجھ دار اور مہذب لوگ اور خاص کر سرکاری طبقہ کی نگاہ میں جو ہماری عزت ہے اسکا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ کوئی سرکاری پارٹی یا احکام کی دعوت کا جلسہ ہوا اس میں صرف کارڈ آنا کیا بلکہ اکثر اسکے انتظام کا فخر بھی ہمیں کو حاصل

ہوتا ہے۔

اپنے شہر میں تو ہمارے پوزیشن سے ہر شخص واقف ہی ہے۔ لیکن شہر کے باہر اس خیال سے کہ ناواقفیت کے باعث عوام کی طرح خاص لوگ ہمیں بھی معمولی درجہ کا آدمی نہ سمجھنے لگیں۔ کسی نہ کسی طرح اپنا تعارف کرا کے ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بار کلکتہ جاتے ہوئے جس ڈبّہ میں ہم سفر کر رہے تھے۔ ایک جنٹلمین صاحب آکر ہمارے بغل میں بیٹھ گئے اور معمولی آدمی سمجھ کر ہم سے مخاطب تک نہ ہوئے۔ ہماری عادت ہے کہ جہاں کسی نئے شخص سے ملاقات ہوئی صاحب سلامت کے بعد فوراً ان کا نام، مقام، و ذریعۂ معاش پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کی حالت معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اسکے جواب میں اخلاقاً وہ بھی ہمارا نام اور پتہ اور ضروری حالات پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنی آنریری مجسٹریٹی سے واقف کر لنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے اسی مقررہ اصول کے مطابق ہم نے انکا نام اور پتہ اور دیگر ضروری اور غیر ضروری حالات پوچھے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت فرسٹ کلاس کے ڈپٹی مجسٹریٹ اور گھر کے بھی خوشحال ہیں۔ جب وہ ہمارے سوالوں کے جواب میں اپنا پورا قصہ کہہ چکے تو اب ہم ان کے متوقع

سوالوں کے جواب دینے کے لئے آمادہ ہوکر بیٹھے کہ جلد اُپنی آنریری مجسٹریٹی سے انکو واقف کرادیں مگر بجائے اسکے کہ وہ ہمارا نام، پتہ اور دوسرے ضروری حالات از قسم آنریری مجسٹریٹی وغیرہ دریافت کریں اس مردِ خدا نے اخبار بینی شروع کردی۔ اور اعزازی حالت تو کیا ہمارا نام تک نہیں پوچھا۔ یہ بھی کوئی انسانیت اور شرافت ہوئی کہ ہمیں تو اپنے خاندان بھر کے حالات اور اپنی ڈپٹی مجسٹریٹی تک سے واقف کرادیا اور ہماری آنریری مجسٹریٹی سے واقف ہونے کا موقعہ آیا تو اخبار بینی شروع کردی۔ یہ کس قسم کی ذلیل بات ہے وہ حضرت تو اخبار بینی میں مشغول اور ہمیں یہ الجھن کہ کس طرح اپنے پوزیشن کا اظہار کریں۔ دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انھیں تو ہم ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے دیکھیں اور ہم انکے نزدیک ایک معمولی آدمی سمجھے جائیں جس طرح سے ہو ہمارے پوزیشن سے انکو واقف ہونا پڑیگا یہ پختہ ارادہ کرکے ہم نے اس طرح کی گفتگو چھیڑی جس میں ہماری آنریری مجسٹریٹی کا ذکر آنا لازمی تھا۔ ہم نے یہ پوچھا کہ جناب! آپ کے شہر میں آنریری مجسٹریٹوں کی کیا تعداد ہے؟ لیکن ۔۔۔۔

"ہمیں معلوم نہیں"۔ کہکر انھوں نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا اسکے بعد ہم نے ایک ایسی ترکیب نکالی جس سے مجبوراً انھیں واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم نے کہا کہ مہربانی فرماکر آپ ہمیں اپنا

ایڈریس عنایت فرمائیں اور ہم بھی اپنا نام اور پتہ لکھ کر جناب کو دیتے ہیں تاکہ کبھی کبھی ضرورت کے موقعہ پر خط وکتابت ہو سکے۔ انھوں نے بادلِ ناخواستہ اپنا کارڈ دیا۔ ہم نے بھی ایک پرزہ پر فوراً اپنے نام کے ساتھ موٹے حرفوں میں آنریری مجسٹریٹ لکھ کر انکے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر خدا سمجھے ایسے بد اخلاق سے کہ نظر اخبار پر جمائے ہوئے نہایت ہی بے پروائی کے ساتھ اس پُرزہ کو بغیر پڑھے یونہی اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ عجیب بد دماغ سے پالا پڑا۔ جب دیکھا کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ برجستہ ہم نے کہا کہ اس پرزہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے نام کے ساتھ صرف آنریری مجسٹریٹ لکھ دینے سے بھی ہمیں خط مل جائیگا۔ اس پر انھوں نے مسکرا کر کہا کہ ماشاء اللہ آپ آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں؟ ہم نے کہا کہ محض خدا کی دین اور آپ لوگوں کے دعا کی برکت ہے ورنہ ہیچمدان کس لائق ہے۔ دل میں کہا کہ یہ حضرت بڑے "ہیچمن دیگرے نیست" بنے بیٹھے تھے۔ اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ دنیا میں کیا بلکہ ریل میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر عزت اور مرتبہ والے آدمی موجود ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔

گورنمنٹ کی یہ بات اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ داروغہ، انسپکٹر جیسے محدود اختیارات والے معمولی عہدہ داروں کو

تو ایک خاص امتیازی وضع کا لباس عنایت کر کے انکی ممتاز حیثیت کو پبلک میں نمایاں رکھتی ہے تو کیا ہم آنریری مجسٹریٹ ان پولیس والوں سے بھی گئے گذرے ہیں کہ ایک ادنی چپراسی اپنی لال پگڑی سے لوگوں کو مرعوب کرتا رہے اور ایک آنریری مجسٹریٹ اتنے اونچے درجہ کا حاکم ہونے کے باوجود محض آنریری مجسٹریٹی کی کوئی خاص وردی نہ ہونے کے باعث کس مپرسی میں پڑا رہے۔ جس طرح گورنمنٹ نے ہم نیاز مندوں کی عزت و آبرو بڑھانے کے لیئے یہ آنریری مجسٹریٹی کی جگہ قائم کی ہے اسی طرح ازراہ عزت افزائی کوئی خاص وردی بھی بنوا دیتی تو آئے دن جو نا واقف لوگوں پر موقعہ بے موقعہ ہم لوگوں کو اپنی آنریری مجسٹریٹی خود ظاہر کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اس سے نجات مل جاتی۔ باقی رہا یہ سوال کہ وردی کی وضع کیا ہو تو یہ سرکار کو اختیار ہے چاہے ہائی کورٹ کے ججوں کے گون کی طرح ڈھیلا ڈھالا لبادہ ہو۔ یا پولیس افسروں کی ہاف پینٹ کی طرح مختصر جانگھیا جو کچھ بھی ہو مگر وردی ضرور ہو۔ اگر گورنمنٹ خرچ کے خیال سے اس تجویز کو نہیں قبول کرتی تو جس طرح خطاب یافتہ حضرات اپنی گرہ سے نکال کر سرکاری خلعت حاصل کرتے ہیں ہم لوگوں کو بھی اپنی وردی کے کپڑے کی قیمت اور سلائی کی اجرت اور بوتام وغیرہ کے دام سب جوڑ کر

دینے میں عذر نہیں بلکہ ہماری تو رائے ہے کہ ہر امیدوار آنریری مجسٹریٹی سے اس وردی کے دام پیشگی رکھوا لئے جائیں۔

مضمون چونکہ طویل ہو گیا ہے اور اس وقت اپنے پیشکار صاحب سے ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھوانا، بعض سفارشوں کی وجہ سے ایک لکھے ہوئے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا اور ایک مقدمہ کے کار پرداز سے کچھ پرائیویٹ گفتگو کرنا ہے اور کچہری میں جانے کا وقت بھی قریب ہے اس لئے اس مضمون کو اس وقت ملتوی کر کے کسی دوسری تاریخ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

طنزیات مانپوری

"دوستی"

موجودہ مغربی دور تہذیب میں جب وضع و لباس، تمدن و معاشرت، عقائد و خیالات، عادات و خصائل میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تو پھر بعض پرانے خیال کے قدامت پرستوں کا دوستی کے قدیم

رسم ورواج پر اب تک قائم رہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ دوستی کا یہ پرانا دستور کہ اگر ضرورت پڑے تو ایک دوست دوسرے دوست کے لئے جان و مال سب کچھ قربان کر دے۔ دوستی کا کس قدر خطرناک معیار ہے۔ خدا بھلا کرے آج کل کی مغربی معاشرت کا جس نے دوستی کے اس پرانے دستور اساسی کے کل دفعات بھی بدل دیئے۔ ریفارم اسکیم کی رو سے گو مکمّل سیاسی آزادی نہیں ملی لیکن مغرب کی موجودہ معاشرتی اسکیم نے دوستی کی ان پرانی جکڑ بندیوں سے تو لوگوں کو آزاد کر دیا۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ جہاں پہلے تلاش کرنے پر بھی دوست نہیں ملتے تھے اب خدا کے فضل سے دوستوں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ان کا نام یاد رکھنا تو خیر بعض وقت دوستوں کی صورت پہچاننی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانہ میں برسوں کی تلاش و جستجو کے بعد کسی خوش قسمت کو ایک دوست بھی مل گیا تو اس پر ہزاروں فخر و ناز کہ میرا ایک دوست ہے اور یہاں آج کل دوستوں کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ جان چھڑانی مشکل۔ بات اصل یہ ہے کہ اگلے زمانے میں دنیا بھر کی چیزیں تو سستی تھیں مگر دوستی کی قیمت اس قدر زیادہ ادا کرنی پڑتی تھی کہ مال تو مال بعض وقت جان تک کی نوبت آجاتی تھی

اور آج کل بفضلہ تعالیٰ زندگی کے لوازمات ہزار گراں سہی مگر دوستی
کی یہ موجودہ ارزانی اگلوں کو کہاں نصیب کہ ایک پیالی چائے
پلا دی اور دوست بنا لیا۔ ڈبے سے نکالا ایک پان پیش کیا اور
یارانہ ہوگیا۔ ایک عدد سگریٹ بڑھا دیا یا صرف دیا سلائی منہ کے
پاس لے جاکر سگریٹ سلگا دیا، دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔
جہاں اتنے سستے داموں رستہ چلتے دوستی دستیاب ہوتی ہو وہاں کسی کی
شامت آئی ہے کہ قدامت پرستوں کی طرح دوستی کے پیچھے
اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگلے لوگوں نے
دوستی کو ایسی مشکل اور ناقابل حصول شئے کیوں بنا دیا تھا جسکے
شرائط میں سے معمولی اور ادنیٰ شرط یہ بھی ہے کہ ایک دوست
کی خوشی وغم میں دوسرے دوست کو شریک ہونا لازمی۔ دوست
کی خوشی میں تو شرکت ایک ضروری چیز ہے۔ جس پر آج کل
کے احباب نہایت ہی سختی سے عمل پیرا ہیں۔ مگر رنج وغم کے موقع
پر کسی مصیبت زدہ دوست کے یہاں پہنچکر اسکا غم تازہ کر کے
خود کو اور اس آفت رسیدہ دوست کو پریشان کرنا کہاں کی
عقلمندی ہے۔ اس طرح دوستی کی یہ شرط بھی یقینی قدرے
ترمیم طلب ہے۔ جس کی رو سے دوست کے مال کو اپنا اور
اپنے مال کو دوست کا سمجھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس

شرط کے پہلے حصّے سے کسی سمجھ دار آدمی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس زریں اصول پر آج کل کے یارانِ طریقت کاربند بھی ہیں البتہ اس کا دوسرا ٹکڑہ یعنی اپنی چیز کو دوست کی چیز سمجھنا یہ ذرا کچھ مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے کہ اپنی چیز تو بہر حال اپنی ہے ہی۔ اسکے علاوہ دوستی کا یہ قدیم اصول بھی کس قدر عجیب و غریب ہے کہ دوست کی کمزوریوں اور اس کے عیوب کو منھ پر کہدینا دوست کا اولین فرض ہے۔ بیٹھ پیچھے کسی کی برائیوں کا ذکر کرنا چونکہ موجودہ سوسائیٹی کے نزدیک معیوب نہیں اسلئے وہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن کسی کے عیب کو اسکے سامنے کہنا اول تو موجودہ تہذیب کی بنا پر ایٹی کیٹ کے خلاف ہے۔ دوسرے اگر ڈیفمیشن سوٹ ٹھونک دیا گیا تو حق دوستی ادا کرنے کے بدلے وکیلوں کا حق محنت ادا کرتے کرتے آپ کا دیوالہ نکل جائے گا۔ اسکے ساتھ قدیم دوستی کی ایک اور نئی شرط بھی سن لیجئے۔ وہ یہ کہ ایک دوست کو دوسرے دوست کا مشیر اور راز دار ہونا بھی ضروری ہے اور یہ راز داری صرف عام معاملات ہی میں نہیں بلکہ دوست کی خانگی زندگی میں بھی اسکا مشیر اور ہمراز بن کر ہر طرح کی مدد سے اسکی اندرونی پریشانیوں کے دور کرنے کی کوشش کرے ..... دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنا

اسی کو کہتے ہیں۔ اس مہذب زمانے میں جبکہ دوست کیا دوست کے باپ کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ کسی کے ذاتی معاملات اور اسکی پرائیویٹ باتوں میں دخل دے۔ دوستی کا مذکورۂ بالا اصول کس قدر خلاف تہذیب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غیرضروری باتوں کو دوستی کے فرائض میں داخل کرنے کی ضرورت اُس وقت اسلئے آپڑی تھی کہ اگلے زمانے کے لوگوں نے اسکا اندازہ کیا نہیں کہ آئندہ چل کر زمانہ جب ترقی کے انتہائی معراج پر پہنچ جائے گا تو دوستی کی کتنی نئی نئی قسمیں پیدا ہوجائینگی۔ اس پر کافی غور کئے بغیر اپنے ہی زمانے کے ماحول کے مطابق دوستی کا یہ محدود معیار قائم کردیا کہ ؎

دوست آں دانم کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

اب آپ ہی کہئے کہ دوستی کی اس پرانی کسوٹی پر آج کل کے احباب کو پرکھنے کا یہ نتیجہ ہوگا یا نہیں کہ سیکڑوں دوست اپنے ہاتھ سے نکل جائیں؟ دوستی جیسے وسیع المفہوم لفظ کو اس قدر محدود معنی میں مقید کرنا اگلوں کی سخت اصطلاحی غلطی تھی۔ انھیں چاہیئے تھا کہ دوستی کے مختلف اغراض ومقاصد اور اسکے برتنے کا جدا جدا موقع اور محل کا لحاظ کرکے دوستی کی جتنی مختلف صورتیں

پیدا ہو سکتی تھیں سب کی جدا جدا قسمیں اور پھر ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات بیان کر کے دوستی کی ایک ایسی جامع تعریف کرتے جو کل اقسام دوستی پر صادِق آتی۔

موجودہ زمانے میں دوستی کی جتنی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں ان میں سے چند کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) کلبی دوستی:۔ یہ خیال کر کے کہ حسب عادت کاتب نے غلطی کی یا مضمون نگار ہی ایسا کٹر پنجابی ہے کہ جیسے بولنا تو درکنار (ق) لکھنا تک نہیں آتا۔ آپ اس کلبی کو کہیں قلبی دوستی نہ سمجھ لیں۔ اسکو بھلا قلب اور دل سے کیا لگاؤ۔ محض چند گھنٹے تفریح، مذاق، ہنسی، دل لگی کے لئے کسی کلب کے ممبر آپس میں جو بے تکلفانہ مراسم پیدا کر لیتے ہیں اسی کا نام کلبی دوستی ہے جو صرف کلب کے احاطہ ہی تک محدود رہتی ہے۔ کلب سے باہر نکلے کل سامان تفریح کی طرح دوستی کو بھی وہیں چھوڑ آئے۔ اسکے بعد کسے را با کسے کارے نہ باشد۔ ما بخیر شما بسلامت کا اصول رہ جاتا ہے۔

(۲) سفری دوستی:۔ حالات سفر میں بہت سے عجیب و غریب غیر متوقع واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ انہی میں سے ایک سفری دوستی بھی ہے۔ جیسے شان دگمان اتفاقی طور پر دو اجنبیوں

کے لئے تھوڑی دیر تک سامان دلچسپی بن جاتی ہے جس کی ابتدا تو دریافت نام سے ہوتی ہے۔ پھر سکونت، پیشہ، مالی حیثیت کی تفتیش سے بڑھتے بڑھتے تعداد اولاد و دیگر خانگی امور کی بازپرس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادھر سے پان، اُدھر سے سگریٹ، ادھر سے چائے، ادھر سے ناشتہ کا تبادلہ بھی ہونے لگتا ہے۔ اسکے بعد خط لکھنے اور دوبارہ ملاقات کے قیمتی وعدے پر اسکا خاتمہ ہوتا ہے۔ غرض سفر کی منزل ختم ہونے کے پہلے چند ہی گھنٹوں میں دوستی کے کل مراحل طے کر لئے جاتے ہیں۔ پھر یہ سارے دوستانہ گرمجوشیاں ریل کے ڈبے سے باہر نکلتے ہی مسافروں کی بھیڑ میں ایسی غائب ہو جاتی ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد اگر کہیں دونوں میں اتفاقی مڈبھیڑ ہو گئی تو دیر تک ایک دوسرے کو تکتے رہنے کے بعد سلسلۂ گفتگو از سرنو اس طرح شروع ہوتا ہے:

ایک:- اسکے پہلے بھی آپ سے کہیں نیاز حاصل ہے۔

دوسرا:- مجھے بھی یاد آتا ہے کہ کہیں آپ کو دیکھا ہے۔

یہ ہے سفری دوستی جس سے اگلوں کو شاید ہی کبھی واسطہ پڑا ہو۔

(۳) اخلاقی دوستی:- اخلاق اور خاص کر نمائشی اخلاق

عجیب فریب دہ چیز ہے۔ جس کسی کے ساتھ آپ ایسے برتیں وہ غریب خواہ مخواہ دوستی کے مغالطہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ آج کل کے بڑے لوگوں میں خلوص و محبت تو ہوتی نہیں، لے دے کر ان کے پاس صرف ظاہری اخلاق ہے جسے ابتدا میں تو ضرورتاً اور پھر عادتاً برتنے پر وہ مجبور ہیں اور یہ بہت سے ناواقفوں کے لئے مصیبت کا سامان بن جاتا ہے اکثر ناتجربہ کار بڑے آدمی کے دوست ہو جانے کے وہم میں مبتلا ہو کر بہت سی امیدیں انکے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں جو کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتی۔ سچ پوچھئے تو اس میں صاحب اخلاق کا کوئی قصور نہیں۔ اس طرح کے نمائشی اخلاق بڑے لوگوں سے عادتاً سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ اب کوئی اسے دوستانہ برتاؤ سمجھ کر غلط توقعات قائم کر لے تو اس پر کیا الزام! دوسروں کو کیا کہا جائے خود مجھے ایک جج صاحب کے بے تکلفانہ برتاؤ نے انکی دوستی کے مغالطہ میں ڈال دیا اور اسی دوستی کے زعم میں ایک کام کی فرمائش بھی میں نے ان سے کر دی۔ گو یہ ایک محض معمولی کام تھا اور انھوں نے نہایت فراخ دلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ اسکے پورا کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ ساتھ ہی یقین دلانے کے لئے یہ بھی کہا کہ دوست کے کام کو میں اپنا کام سمجھتا ہوں

مگر بدقسمتی سے نکلی وہ اخلاقی دوستی جس کو دلی خلوص سے کچھ لگاؤ ہی نہ ہوتا۔ اب اگر متواتر یاد دہانیوں کے باوجود اسے پورا نہ کرسکے تو اس میں ان کا کیا قصور؟ قابل شکایت بات تو اس وقت ہوتی جب صحیح معنوں میں واقعی دوستانہ تعلقات ہوتے ------ کسی کو اسکی ظاہری خوش اخلاقی پر اپنی خوش خیالی سے کوئی اپنا دوست سمجھ لے تو یہ سمجھنے والے کا قصور ہے نہ کہ اس اخلاق برتنے والے کا۔

(۴) کاروباری دوستی:۔ اصلی اور کاروباری دوستی میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ وہی آمدورفت، وہی دوستانہ تعلقات وہی خلوص و محبت کی باتیں۔ وہی بے تکلفانہ برتاؤ۔ غرض دوستی کے جتنے لوازمات ہیں ایک ایک کرکے سب اس میں موجود البتہ روپئے پیسے کا معاملہ جب آجاتا ہے تو اس وقت عارضی طور پر یہ دوستانہ مراسم نظر انداز کردیئے جاتے ہیں۔ ایسا موقعہ ہر وقت اور ہر شخص کے ساتھ پیش تو آتا نہیں اسلئے جس کو ایسے دوستوں سے سابقہ پڑا ہے اسکے سوا دوسرا اس فرق کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی اپنے ایک کاروباری دوست کے دوستانہ تعلقات سے مستفیض ہونے کا موقع مل چکا ہے اسلئے اسکا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں۔

قصہ یوں ہے کہ ایک ڈگری کی ادائیگی کے لئے مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت آپڑی۔ مختلف جگہوں میں کوشش کے باوجود اتفاق سے اسکا سامان نہ ہوسکا اور ادائیگی کی مدت میں صرف ایک روز باقی رہ گیا۔ ہر طرح سے مایوس ہوکر گھبرایا ہوا ایک ایسے بے تکلف دوست کے پاس پہونچا۔ جو خوش حال زمیندار ہونے کے علاوہ مہاجنی کاروبار بھی کرتے تھے۔ مجھے پریشان صورت دیکھ کر نہایت ہی تپاک کے ساتھ انھوں نے خیریت پوچھی۔ میں نے اپنے آنے کی غرض اور اس فوری ضرورت کو بیان کرتے ہوئے کہا "اور روپئے میرے پاس ہیں صرف ڈیڑھ دو ہزار ملنے سے میرا کام چل جائے گا۔ اور وہ بھی فقط دو ہفتہ کے لئے بلکہ اسکے اندر ہی موضع سے روپئے آنے کے ساتھ ہی واپس کردونگا۔ چونکہ کل تک ڈگری کی پوری رقم داخل نہ کرنے سے جائداد کے نیلام ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اسلئے میں نے سوچا کہ تم سے دست گرداں لے کر کام نکال لوں انشاءاللہ ہفتہ کے اندر ہی واپس کردونگا۔"

پہلے تو انھوں نے میری کل باتیں غور سے سنیں۔ جب ضرورت کی اہمیت کا انھیں پورا اندازہ ہوگیا تو دوستانہ بے تکلفی نے کاروباری متانت کی صورت اختیار کرلی اور بغیر جھجھک کے

نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ کہا:۔
"بھئی دوستوں کے ساتھ مہاجنی کاروبار سے حتی الامکان میں احتیاط برتتا ہوں۔" میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔"یہاں پر مہاجنی کاروبار کا کیا ذکر میں تو صرف آٹھ دس روز کے لئے ایک دوست کی حیثیت سے دست گرداں مانگتا ہوں۔" چند منٹ تک سوچنے کے بعد انھوں نے کہا۔"دست گرداں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ باقی رہا قرض تو تم جانتے ہی ہو کہ آج کل کوئی مہاجن سیکڑے دس روپئے نذرانہ اور تین روپئے ماہانہ سود سے ادھر بات ہی کرنا نہیں چاہتا۔ اور خاصکر ہینڈ نوٹ پر دینے کے لئے شاید ہی کوئی راضی ہو۔ اور کابلیوں کو تو پوچھئے ہی مت وہ تو اور بھی سیکڑے دس بارہ روپئے سے کم پر روپئے لگاتے ہی نہیں۔ اب اگر تمھارے کام نکلنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو چونکہ دوستی کا واسطہ ہے اسلئے معاملہ کی صفائی کے لئے نذرانہ اور سود پہلے طے ہو جانا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔"ایسی ضرورت کے موقع پر دوستانہ تعلقات کے باوجود اس طرح مہاجنی برتاؤ کہاں تک ایک دوست کے لئے مناسب ہے۔" اسکا جواب جو انھوں نے دیا وہ واقعی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہا۔"میرے

تمھارے جو دوستانہ مراسم ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں اور یہ ہے معاملہ بزنس کا۔ دوستی دوستی ہے۔ بزنس بزنس ہے۔" ہیں انکے کاروباری انداز گفتگو اور اپنی ضرورت پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے شرائط میں اس وقت اگر کچھ بھی عذر کیا تو دوستی بزنس کی نذر ہو ہی چکی کہیں یہ ضروری بزنس بھی دوستی کی نذر ہو کر نہ رہ جائے۔ مجبوراً دوستانہ مراسم کو مہاجنی تعلقات میں منتقل کر کے انکی مطلوبہ شرائط کے ساتھ ہینڈ نوٹ پر بلا جبر و اکراہ و بلا تحریص و ترغیب و بغیر بہکانے و پھسلانے و دباؤ نا جائز کے بدرستگی ہوش و حواس دستخط کر دیا۔ اور نذرانہ کی رقم معہ سود پیشگی شکریہ کے ساتھ حوالہ کرنے کے بعد بقیہ لئے ہوئے ہرچہ از دوست می رسد نیکو ست کہتا ہوا اپنے گھر واپس پہنچا سود کے ساتھ پیشگی شکریہ ادا کرنا بھی اسلئے ضرور تھا کہ سود در سود و تاوان و خسارہ کی رقم بھی اگر وہ پہلے ہی رکھوا لیتے تو میں کر ہی کیا لیتا۔ یہ ایک دوست کا ایسا احسان تھا کہ جسکے بوجھ سے اسکے سامنے ہمیشہ میری گردن اگر جھکی نہیں تو ٹیڑھی ضرور رہے گی۔

(۵) استحفاظی دوستی :۔ دوستی کی اور جتنی قسمیں ہیں روابط اور تعلقات کے اعتبار سے تو نہیں مگر اغراض و مقاصد کے

لحاظ سے ان سب سے یہ جداگانہ قسم کی دوستی ہے۔ اسکی بنیاد دوست سے بھلائی کی امید پر نہیں بلکہ "مراز خیر تو امید نیست" کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فتنہ پرداز دوست کی شرارت اور فساد سے بچنے کے لئے دوستانہ روابط پیدا کئے جاتے ہیں۔ سرحد کے آزاد قبائل کے ساتھ گورنمنٹ کے دوستانہ تعلقات یا پولیس والوں سے بعض لوگوں کے دوستانہ مراسم اس کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۶) سیاسی دوستی :- یہ دوستی اپنے گوناگون مقاصد کے اعتبار سے اس قدر پیچیدہ ہوتی ہے کہ عوام تو عوام بہت سے پڑھے لکھے دو سیاسی دوستوں کے متعلق صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کہ آپس میں یہ دونوں دوست ہیں یا دشمن!۔ دوسروں کو چھوڑیئے میں تو کہتا ہوں خود ان دونوں دوستوں کو بعض وقت یہ فیصلہ کرنے میں دقت پڑتی ہے کہ ہم دونوں کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں یا معاندانہ۔ اس دوستی میں پہلی شرط یہ ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی کسی بات پر اعتبار اور بھروسہ نہ کرے۔ چونکہ قدیم زمانے کی دوستی کی اندھی تقلید سیاسی دوستی میں تو ہوتی نہیں کہ ایک بار جسکا ساتھ دیا تو عمر بھر اُسی کے ہو رہے۔ بلکہ احوال و مواقع و مصالح کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی

ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس لئے اسقدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے کہ ایک معمولی سی لغزش سے بھی دوستی تو دوستی خود اپنی ہستی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ سیاسی دوستی کی زبان اور اسکی اصطلاح بھی عام سمجھ سے بہت بلند ہوتی ہے جسے سیاست دانوں کے سوا نہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے نہ صحیح طور سے استعمال کرسکتا ہے۔ ایسی دوستیاں مصلحتاً اور ضرورۃً زیادہ تر سلطنتیں آپس میں کرتی ہیں اس سیاسی دوستی کی بھی کئی قسمیں ہیں :-

(الف) معیاری دوستی :- اگر قوت و اقتدار میں ایک دوست اپنے دوسرے دوست کا ہم پلّہ ہے تو دونوں قوی دوستوں کا رشتۂ دوستی اس قدر نازک اور کمزور ہوتا ہے کہ دوستانہ کشمکش کے ایک ہی جھٹکے میں ہر وقت اسکے ٹوٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے اسلئے کسی خاص معاہدہ کے ماتحت "معیاری دوستی" قائم کرنی پڑتی ہے جس میں مقررہ مدّت کے لئے باضابطہ دستخطی عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ گو اس تحریری اقرارنامہ کی پابندی دونوں دوستوں کے لئے چنداں ضروری نہیں مگر اسکی خلاف ورزی پر پروٹسٹ کے بعد اسکی تاویل کرنی عہد شکن دوست کے لئے لازمی ہے اور اس عذر گناہ بدتر از گناہ کو مصلحتاً دوسرے دوست کے لئے تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(ب) وقتی دوستی :۔ اسکا دار و مدار وقتی مصلحت پر ہے
پہلا اصول اسکا موقع اور ضرورت ہے۔ وعدہ کا ایفا اور معاہدے
کی پابندی گو اس میں بھی ضروری نہیں لیکن اس کے باوجود
بعض اوقات یہ وقتی دوستی گلے میں ہڈی بن کر ایسی پھنس جاتی
ہے کہ نہ نگلتے ہی بنتی نہ اُگلتے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے
جب وقتی ضرورت سے مجبور ہو کر دو متضاد دوستیاں بیک وقت
کرنی پڑتی ہیں۔ دو ایسی جماعتیں جو اپنے اپنے مختلف مقاصد و
اغراض کے باعث ایک دوسرے کی دشمن ہوں۔ ان دونوں
دشمنوں سے بیک وقت دوستانہ تعلقات قائم رکھنا جس قدر
مشکل ہے اسے وہی خوب سمجھ سکتا ہے جس غریب کو دوستی کی
ان دو کشتیوں میں سوار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ایک سے اظہار ہمدردی
کیا تو دوسرے کا تیور بدلا۔ اور دوسرے کی حمایت کی تو پہلے
نے وعدہ یاد دلا کر ڈانٹ ڈپٹ بتائی۔ اب آدمی کس کا ساتھ
دے کس کا نہیں۔ یہودیوں اور فلسطین کے عربوں سے جس ضرورت
کی بنا پر وقتی دوستی کرنی پڑی تھی وہ پوری ہو جانے کے بعد
اب آپ ہی کہیے کہ ان متضاد دوستیوں کا نباہنا کس قدر
مشکل کام ہے مجبوراً اس دوستانہ کشمکش سے نجات پانے
کی اسکے سوا اور کیا صورت ہو سکتی تھی کہ یا تو ان دونوں کو

آپس میں نپٹ لینے کے لئے چھوڑ دیا جائے یا کسی ایسے کا ساتھ دیا جائے جس سے آئندہ کی اور دوسری امیدیں وابستہ ہوں۔ باقی رہا وعدے اور معاہدے کی پابندی تو جب عام سیاسی دوستی میں یہ غیر ضروری شئے قرار دی جا چکی ہے۔ تو ایسی دوستی میں جسکا نام ہی وقتی دوستی ہے کہاں تک لازمی سمجھی جا سکتی ہے۔

(ج) حمائتی دوستی:- اس دوستی میں البتہ ہر طرح کی اعانت و مدد دوست کا لازمی فرض ہے بشرطیکہ اسکی وجہ سے کسی اور سے دشمنی پیدا ہونے کا احتمال نہ ہو۔ بعض بہی خواہ و ہمدرد دوست کسی مصلحت سے اسکی بھی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے دوست کی اعانت کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت یہ دوستانہ امداد عملی صورت سے منتقل ہو کر صرف زبانی رہ جاتی ہے۔ یوں کوئی کچھ کہے مگر مصیبت میں زبانی ہمدردی سے ہمت بڑھاتے رہنا بھی معمولی مدد نہیں۔ اب اگر حبش والے اپنے کسی حمائتی دوست کو یہ کہکر بدنام کریں کہ ہر طرح کی حمایت کا وعدہ کر کے حوصلہ بڑھا بڑھا کر پہلے تو ہمیں اٹلی سے بھڑا دیا پھر عین وقت پر یہ تسلی دیکر کہ "چڑھ جا بیٹے سولی پر رام بھلا کرے گا" کنارہ کش ہو گئے۔ اب آپ ہی فرمائیں ان کا

یہ الزام کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ ان ناعاقبت اندیشوں سے کوئی یہ پوچھے کہ حمایتی دوست کے لئے کس کتاب میں لکھا ہے کہ ایسے موقع پر خواہ مخواہ کسی دوسرے سے دشمنی مول لے کر اپنے بھرم کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

(د) جبری دوستی:۔ جب کوئی چھوٹی اور کمزور حکومت کسی بڑی سلطنت کی نظر عنایت کا مرکز بن جاتی ہے تو بڑی سلطنت کی دوستانہ ہمدردی مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر کمزور کے گلے میں دوستی کا طوق زبردستی ڈال دیتی ہے۔ اب یہ غریب لاکھ چیخے چلائے کہ "بخشو بلی چوہا لنڈورا ہی جیئے گا" مگر صورۃً یہ گربہ مسکین دوست اس کی جان کب چھوڑتا ہے خواہ مخواہ اسکا سرپرست دوست بن کر اسکی بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ پھر یہ دوستانہ تعلقات بڑھتے بڑھتے من تو شدم تو نہیں مگر تو من شدی کی صورت اس لئے اختیار کر لیتے ہیں کہ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔

سیاسی دوستی کی مذکورۂ بالا چند مثالوں سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس قسم کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں صرف یورپ ہی والے ماہر ہیں بلکہ مغربی سیاست کے فیض و برکت سے

ایسی دوستیوں کا رواج ہندوستان میں بھی خدا کے فضل سے ہو چلا ہے۔ یورپ کے مدبّر جن کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ہوتی ہے وہ اگر کامیابی کے ساتھ ایسی دوستیاں نباہ سکتے ہیں تو بفضلہ تعالیٰ یہاں کے لیڈر بھی جن کے ہاتھ میں قوم کی تکمیل ہے کسی بات میں ان سے ہیٹے نہیں۔ وقتی ضرورت کی بنا پر یہودیوں اور فلسطین کے عربوں کے ساتھ بیک وقت دو متضاد دوستیاں کی گئیں اور جس طرح اب اسکی نباہ کی جارہی ہے بعینہ یہاں بھی وہی جبری دوستی کی کوشش کی جارہی ہے۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں موجودہ زمانے میں جبکہ دوستی کی اتنی نئی نئی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں قدیم زمانے کے دوستوں کی طرح آج کل کے احباب سے بھی اسی طرح عملی ہمدردی کی امید رکھنا کس قدر فرسودہ خیال ہے۔ باقی رہی زبانی ہمدردی تو بیچارے اگلے زمانے والوں کے پاس اسکے اظہار کے لئے الفاظ کا اتنا ذخیرہ کہاں تھا جو آج کل کے احباب ایسے موقع پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مصیبت کے موقع پر میرے دوستوں نے ہمدردی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس مصیبت کے دور ہو جانے کے بعد اسکا اثر اب تک میرے دل پر ہے۔

کئی سال ہوئے کہ چند احباب کے مشورہ سے میں نے

غلّہ کی تجارت شروع کی۔ اب اسے میری بدقسمتی کہئے یا ناتجربہ کاری کہ یکایک بازار گر جانے کی وجہ سے ایک ہی سال کے اندر جو کچھ رہی سہی پونجی تھی وہ تو غائب ہی ہو گئی ، مہاجن اور آڑھت والے کا بقایا جو میرے ذمّہ گر گیا وہ جُدا نفع ہیں۔ اس ناقابل برداشت مالی نقصان نے جیسی میری قابل رحم حالت بنا دی اُسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میری اس مصیبت کا حال سُن کر روزانہ ملنے والے احباب میں سے بعضوں نے تو غالباً اس وجہ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا کہ غائت محبت کے باعث شاید میری پریشانی ان سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ بعض دوستوں نے اگر جس طرح حق دوستی ادا کرنا شروع کیا وہ موجودہ دوستی کی بہترین مثال ہے۔

ایک مہربان :۔ یہ غلے کے کاروبار میں تمھیں گھاٹا کیسے ہوا؟

میں :۔ تجارت میں عموماً جس طرح گھاٹا ہوتا ہے۔ بس ویسے ہی سمجھئے۔

دوسرے کرم فرما :۔ آخر یہ تجارت کی تمھیں کیا سوجھی تھی۔

میں :۔ چونکہ بدقسمتی سے چوری کرنا یا جیب تراشنا مجھے آتا ہی نہیں اسلئے مجبوراً تجارت ہی شروع کر دی

تیسرے بہی خواہ :۔ اگر تجارت ہی کرنی تھی تو یہ کیا ضرور تھا کہ

غلّہ ہی کی ہو جس میں کوئی تجربہ نہیں نہیں۔ بعض تجارتیں ایسی نفع بخش ہیں جن کی بدولت آدمی تھوڑے ہی دنوں میں مالا مال ہو جائے۔

میں :- جی ہاں۔ میرا ابھی یہی ارادہ تھا کہ افیون یا کوکین کی خفیہ تجارت شروع کر دوں مگر اسکو کیا جائے کہ غلّہ کے کام سے بھی زیادہ اس میں ناتجربہ کار تھا۔

چوتھے دوست :- افسوس! یہ بیٹھے بٹھائے تم نے مفت مصیبت مول لے لی۔

میں :- بیٹھے بٹھائے تو نہ کہنا چاہئے۔ اس تجارت میں مجھے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی اور آپ کو مفت مصیبت لینے پر جو افسوس ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اتنی کثیر رقم صرف ہونے کے باوجود مفت مول لینے کا مجھ پر غلط اتہام ہے۔

پانچویں شفیق حال :- تمھاری اس مصیبت سے مجھے دلی صدمہ پہنچا مگر اپنے کیئے کا کیا علاج۔

میں :- معاف کیجئے گا غلطی ہوئی۔ انشاءاللہ آئندہ کبھی ایسی گستاخانہ حرکت اس خاکسار سے سرزد نہ ہوگی جس سے آپ کو دلی صدمہ پہنچے۔

چھٹے ہمدرد :- جس کام سے آدمی کو واقفیت نہ ہو اس میں

بے سمجھے بوجھے کود پڑنا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ اتنی کثیر رقم کا خسارہ خود اپنی حماقت کا نتیجہ ہے۔

غرض جو آیا غمگسار دوست کے بدلے ناصح مشفق ہی بن کر آیا میں بھی کڑھ کر انکی تکلیف دہ اور بے محل باتوں کا اسی طرح اول فول جواب دیتا رہا۔ ایک تو نقصان مایہ اس پر شماتت ہمسایہ نے میرے زخم خوردہ دل پر اور بھی نمک پاشی کی۔ ایسی مصیبت کے وقت میں ان ناصحانہ زبانی ہمدردیوں نے مرہم کی بجائے نمک بر جراحت ہو کر میرے زخموں کو اور ہرا کر دیا۔ اس وقت بے ساختہ میری زبان پر یہ مصرعہ آگیا۔ ؎

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

جی چاہتا تھا کہ اگر چارہ ساز نہیں تو کم سے کم صرف غم گسار ہی کوئی ایسا ہوتا جس کے پاس اپنی دکھ بھری کہانی دل کھول کر کہتا اور اس داستان غم کا اثر اسکی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ کسی نے میری آدھی مصیبت بانٹ لی ہے مگر ایسے مخلص ہمدرد اب کہاں؟ زمانہ ہوا کہ دنیا ان سے خالی ہو گئی! اب تو ویسے ہی دوست رہ گئے ہیں جن پر یہ مصرعہ صحیح طور پر صادق آتا ہے ؎

ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مطائبات مانپوری

اخبار بینی

جس طرح گاؤں میں تقریباً ہر اَن پڑھ دیہاتی مزدور یا کاشتکار ہونے کے علاوہ "حکیم" ہوتا ہے۔ اسی طرح شہر میں ہر پڑھا لکھا شہری طالب علم، کلرک ہونے کے علاوہ "اخبار بین" ہوتا ہے مگر اخبار بینوں کی بھی جماعتیں ہیں۔ پہلی جماعت تو اُن اشخاص کی ہے جو وقتاً فوقتاً میاں فضل کریم کے بُک ڈپو کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں" السلام علیکم۔ خیر و عافیت" جیسی رسمی گفتگو کے بعد مالک دُکان کے کاروبار میں سطحی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں فضل بُک ڈپو نہایت عزیز ہے۔ اسکے بعد اخبارات اور رسائل اٹھا اٹھا کر یوں پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ گویا فضل بک ڈپو نہیں بلکہ پبلک لائبریری ہے۔ جہاں "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" مطالعہ کے دوران میں میاں فضل کریم کی آنکھ بچا کر کوئی اچھا

شعر یا کسی ایکٹریس کا پتہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک رسالہ کی ورق گردانی کے بعد اسے نہایت بے اعتنائی سے غلط جگہ پر رکھتے جاتے ہیں۔ جب علمی اور ادبی رسائل پڑھ چکے تو فلمی رسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اوہو! مصوّر نے کتنا ضخیم ایکٹریس نمبر نکالا ہے۔ بھئی سرورق پر ستارہ کی تصویر تو خوب زیب دے رہی ہے۔" ارے کیا فلم انڈیا نے ابھی سے سالنامہ شایع کر دیا۔ ذرا دیکھیں کوئی کام کی تصویر ہے بھی یا نہیں؟" اس طرح ایک دو گھنٹہ اخبار بینی کا شغل جاری رہتا ہے۔ اسکے بعد میاں فضل کریم پر سوالات کی بوچھار کی جاتی ہے اور ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ولایتی ڈاک کے آنے میں اس دفعہ اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟ ان کے ڈیوس ٹروا سٹوری اور ٹرو رومانس کیوں نظر نہیں آتے؟ رسالہ ادب عالم کیوں بند ہو گیا؟ چلتے چلتے انھیں یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ سویرا کا دو ماہی نمبر خوب ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بکے گا۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گو رسالہ ہزاروں کی تعداد میں بکے گا ہم کبھی ایک کاپی مول نہیں لینگے۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اخبار بینی کے لئے اپنے ہمسائے کے مرہون منت ہیں اگر وہ ہوسٹل میں رہتے ہیں تو

ایک ایسا ساتھی تلاش کرتے ہیں جو روزانہ اخبار خریدنے کا عادی ہو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ "اٹھو اٹھو بھائی اب تو پانچ بج گئے ابھی تک بستر پر پڑے ہو۔" آپ لیٹے ہی لیٹے جواب دیتے ہیں۔ "سونے بھی دو یار۔"

واہ! سونے کی ایک کہی۔ اجی اس وقت تک کون سوتا ہے۔ اچھا دروازہ کھولو ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔" طوعاً و کرہاً آپ دروازہ کھولتے ہیں اور کرسی پر دراز ہو کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیشتر اسکے کہ آپ انکی بدتمیزی کا جواب دے سکیں وہ میز پر پڑے ہوئے اخبار کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے گویا اخبار انھوں نے ہی خریدا تھا۔ جس وقت گھڑی آٹھ بجاتی ہے وہ چپکے سے اخبار میز پر رکھ کر اور "آج کوئی دلچسپ خبر نہیں ہے" کہکر تشریف لے جاتے ہیں۔ بصورت دیگر آپ گلی یا محلہ میں رہتے ہیں تو وہاں بھی آپ کو کئی ایسے حضرات ملیں گے جو سالہا سال سے آپ سے اخبار مانگ کر پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں وقت بے وقت وہ آپ کی بیٹھک میں آ دھمکیں گے اور آپ کے ماتھے کے شکن کو دور کرنے کے لئے دو چار تفریحی

یا ہمدردانہ فقرے جڑ دینگے۔ مثلاً اخاہ! نیا سوٹ پہنا ہے کپڑا تو خوشنما ہے۔ سلا ہوا بھی اچھا ہے۔ منّی کا کیا حال ہے؟ چھوٹے میاں کی کھانسی کیسی ہے؟" آپ ان باتوں کا اصلی مقصد اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لئے آپ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہئے۔ مگر کیا کیا جائے کہ بیسویں صدی ہے اور جو بات دل میں ہے وہ زبان پر نہیں لائی جا سکتی۔ ورنہ آپ انھیں کہہ سکتے ہیں کہ "اجی منّی بچے یا مرے، چھوٹے میاں کو کالی کھانسی ہو یا تپ دق آپ تو اخبار پڑھنے آئے ہیں سو اٹھائیے اور پڑھ لیجئے۔

تیسری جماعت ان افراد کی ہے جو اخبار بینی کے لئے لائبریریوں کے محتاج ہیں۔ اس جماعت میں زیادہ تر ریٹائرڈ کلرک اور سال خوردہ وکلا ہوتے ہیں۔ یہ اصحاب اصل میں اخبار پڑھنے نہیں بلکہ وقت کاٹنے آتے ہیں۔ لائبریری کے کھلنے کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے یہ لائبریری کا طواف کرنا شروع کر دیتے ہیں اِدھر دروازہ کھلا اُدھر یہ داخل ہوئے۔ انکو دیکھ کر کئی نو وارد سمجھ لیتے ہیں کہ شاید لائبریری کے انچارج یہی ہیں۔ انکے پڑھنے کا طریق بھی نرالا ہے یعنی ایک اخبار یا رسالہ گود میں ہے اور دو اخبار ملحظ ہیں۔ حریص اتنے ہیں کہ کسی اور کو اس وقت تک

نہ اخبار اٹھانے دینگے جب تک الف سے لیکری تک سارا اخبار پڑھ نہ ڈالیں۔ آپ نے جرأت کر کے انکی گود میں پڑے ہوئے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ عینک درست کر کے کچھ اس طرح خشم آلود نگاہوں سے دیکھیں گے گویا کچا ہی چبا جائینگے آپ نے ہاتھ نیچے کھینچ لیا اور انھوں نے خالی ہاتھ رسالے پر رکھ دیا۔ اب آپ منتظر ہیں کہ وہ رسالہ انکے پنجے سے چھوٹے تو آپ پڑھیں۔ مگر یہ موہوم خیال ہے۔ کیونکہ بڑے میاں جب تک اس اخبار کا جو انکے ہاتھ میں ہے مطالعہ نہیں کر لیتے رسالہ کی باری نہیں آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ تنگ آکر چلے جاتے ہیں۔ مگر جب بھی جاتے ہیں تقریبًا اسی قسم کے لوگوں کو رسائل اور اخبارات پر قابض پاتے ہیں۔

یہ بات بھی نہایت دلچسپ ہے کہ یہ لوگ ہر ایک اخبار میں اُنہی خبروں کو دوبارہ یا سہ بارہ پڑھ کر ایک عجیب خوشی محسوس کرتے ہیں اور گھر آکر اپنے احباب کے زمرے میں انہی خبروں کی بنا پر بڑے بڑے عالمانہ اور فاضلانہ تبصرے کرتے ہیں۔ عمومًا سنسنی پیدا کرنے والی خبریں انکا دل پسند موضوع ہوتی ہیں۔
اجی سنا ہے آپ نے "مراد آباد میں ایک لڑکا لڑکی بن گیا"۔
اجی پڑھا آپ نے" بریلی میں عین شادی کے دن دُلہن غائب ہوگئی"

کیا کہا؟ آپ کو یقین نہیں آتا؟ سترہ تاریخ کا اخبار "احسان" اٹھا کر دیکھ لیجئے۔"

انکے علاوہ اخبار بینوں کی ایک اور جماعت ہے کہ جس سے ریل گاڑی میں سابقہ پڑتا ہے ایک دو با تصویر رسائل، ایک آدھ اخبار لے کر جوں ہی آپ ڈبے میں داخل ہوئے چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوتی ہیں "یہاں بیٹھئے گا، یہاں آئیے گا"۔ آپ سیٹ پر بیٹھتے ہیں اور آپ کے ہم سفروں نے باری باری اخبارات اور رسائل مانگنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ پانچ منٹ کے بعد آپ بالکل کورے رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ابھی تو اخبار کھولا بھی نہ تھا اگر یہی بات تھی تو اخبار خریدنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اب جوں جوں نئے آدمی نئے اسٹیشنوں پر آتے جاتے ہیں آپ کے اخبار پر نئے نئے حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اگر صفحہ نمبر ا آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کے ہاتھ میں ہے تو صفحہ نمبر ۱ ڈبے کے انتہائی کونے میں بیٹھے ہوئے بزرگ کے ہاتھ میں ہے۔ اور صفحہ نمبر ۱۲ کھینچا تانی میں دو ٹکڑے ہو کر دو شریف آدمیوں کو محظوظ کر رہا ہے۔

تقریباً آپ کا تمام سفر اسی انتظار میں گزر جاتا ہے کہ اخبار ملے اور آپ بھی ایک آدھ خبر پڑھ لیں کہ اسی اثنا میں آپ کی آنکھ لگ گئی تو اخبار تک غائب ہو گیا۔ کیونکہ کوئی بزرگ

غلطی ہے یا کسی اور وجہ سے کہ آپ کے اخبار پر کسی ایکٹریس کی رنگین تصویر تھی، اترتے وقت اخبار بھی ساتھ لے جاتے ہیں بہرحال جب منزل مقصود آتی ہے تو آپ اٹھ کر اخبار کا ایک ایک ورق اکٹھا کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے ہیں کہ پھر بھی اخبار چھوڑنے میں نہیں آتے۔ جب آپ اسٹیشن پر اترتے ہیں اور اخبار کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پرسوں ترسوں کا کوئی پرانا پرچہ ہے یا ردی کے چند کاغذ ہیں جن میں شاید آپ کوئی کپڑا یا کتاب لپیٹ کر لائے تھے۔

سنگ و خشت

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

ٹیگور، اقبال، کوہ ہمالیہ اور تاج محل کے علاوہ بہت سی ہستیاں اور اشیاء قابل ستائش ہیں۔ مثلاً مچھر۔ شاعر۔ عشاق۔ یہ تو

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر۔ مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں۔ مچھروں اور شاعروں میں اسلئے بھی مطابقت ہے کہ دونوں شمع روشن ہونے پر بھنبھنانا شروع کرتے ہیں۔ نیز جس طرح مچھروں کی کئی قسمیں ہیں اُسی طرح شاعروں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

(۱) شاعر جو اپنا کلام طبلہ اور سارنگی کے ساتھ گا کر سناتے ہیں۔

(۲) شاعر جو ساری عمر حکومت کے خلاف نظمیں لکھتے ہیں اور آخر میں کسی سرکاری محکمے میں نوکر ہو جاتے ہیں۔

(۳) شاعر جو اپنی نظم کا گراموفون ریکارڈ اپنی آواز میں تیار کرواتے ہیں اور پھر اُسے خود ہی فروخت کرتے ہیں۔

(۴) شاعر جو صرف طوائفوں کے لئے لکھتے ہیں۔

(۵) شاعر جنھوں نے شاعری سکھلانے کے لئے کالج کھول رکھے ہیں

شعرا کے بعد اپنے وطن میں عشاق کا نمبر آتا ہے۔ عشق ہماری گھٹی میں پڑا ہے چنانچہ اپنے وطن کا ہر شخص مجنوں اور کوہکن کا نام لیوا ہی نہیں بلکہ خود مجنوں اور کوہکن ہے۔ عشاق کی صف اول میں کالجوں کے طالب علم ہیں انکا عشق "والہانہ عشق" کہلاتا ہے۔ انکو ہر لڑکی اور ہر عورت سے عشق ہو جاتا ہے۔ بازار میں سے گذرتی ہوئی عورتوں سے۔ ٹانگہ یا موٹر میں سوار کالج کی لڑکیوں سے۔ اسکولوں کی اُستانیوں سے

ہسپتالوں کی نرسوں سے۔ سینما کی ایکٹرسوں سے۔ خوبصورت چینی لڑکیوں کی تصویروں سے۔ انکے اظہار محبت کے طریقے بھی نرالے ہیں معشوق کی طرف گھور گھور کر دیکھنا۔ معشوق کے قریب سے سرک کر گذر جانا۔ اس پر آوازے کسنا۔ اسکا نام کالج کی دیواروں تختۂ سیاہ اور بنچوں پر لکھنا۔ اس پر کاغذ کے غبارے یا چاک کے ٹکڑے پھینکنا۔ طالب علموں کے بعد عشاق کا دوسرا بڑا فرقہ اگر وہ دکان دار طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ انکا عشق "سوقیانہ عشق" کہلاتا ہے۔ انھیں ہر خوبصورت سودا خریدنے والی سے عشق ہوجاتا ہے یہ اپنے عشق کا اظہار تب کرتے ہیں جب معشوق دُکان سے باہر چلا جاتا ہے۔ اسکی عدم موجودگی میں اسکے خدوخال، شوخی و شرارت کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر دکان کے دوسرے آدمیوں یا ہمسایوں سے کیا جاتا ہے۔ عشاق کی تیسری جماعت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پیر سال یا قریب مرگ ہیں۔ انکا عشق "صوفیانہ عشق" کہلاتا ہے۔ انکا مقولہ ہے ؏

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ عبادت گاہوں، مندروں اور جلسوں ہیں عورتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دلی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ عشاق کی آخری جماعت وہ ہے جسکا عشق "غائبانہ عشق" کہلاتا ہے۔ اس جماعت کے افراد کو

نادیدہ محبوب سے عشق ہو جاتا ہے۔ جیسے ریڈیو پر گانے والی تمام
طوائفوں سے۔ خوبصورت برقع میں چلنے والی عورتوں سے۔ ہالی وڈ میں
کام کرنے والی ایکٹریسوں سے۔ ملک کی ہر نامور ادیبہ اور شاعرہ سے

۲

اپنے وطن میں ادبا کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے
یہ صحیح ہے کہ انھیں کوئی شریف آدمی محلے میں مکان کرایے پر نہیں
دیتا۔ کوئی شخص انکے ساتھ اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہتا
اور ان کو انکی نظموں اور مضامین کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا
مگر پھر بھی انکا کافی احترام کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت
سے ہندوستانی ادیب ہوا پر پلتے ہیں۔ چنانچہ جتنا بڑا ادیب ہوتا
ہے اتنا ہی وہ افلاس زدہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا ہندوستانی
ادیب وہ ہے جسکے مرنے پر اُسکے کفنانے اور دفنانے کے اخراجات
میونسپل کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان میں جب
مصنف مرتے ہیں تو اپنے پیچھے لاکھوں پونڈ کی جائدادیں چھوڑ جاتے
ہیں۔ ہندوستان میں جب کوئی مصنف مرتا ہے تو وہ یہ چھوڑ جاتا
ہے۔ ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، غلیظ بستر۔ چند لوٹے اور قرضہ اتنا کہ
مرحوم کی سات پشتیں بھی ادا نہ کرسکیں۔ اپنے وطن میں ادبا کی

شاذ ہی دریادلی سے تعریف کی جاتی ہے۔ اگر وہ کوئی اچھی چیز لکھیں تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے چرائی ہے اور اگر چرائی نہیں تو انھوں نے کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ کر ڈالا ہے اور اگر کبھی کبھار مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے واقعی اچھی چیز لکھی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی وہ رذیل قسم کے ادیب ہیں جنھیں موپساں اور چیخوف سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ چاہے وہ کتنا زور ماریں انکی عظمت کا اعتراف ہمیشہ دبی زبان میں کیا جاتا ہے اور تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ ہنوز دلی دور است۔

۳۰

اپنے وطن میں تنقید کا بھی عجب معیار ہے۔ صرف وہی کتابیں قابل قدر سمجھی جاتی ہیں جن کو ہر شریف آدمی بخوشی اپنی ماں یا بہن کے ہاتھ میں دے سکتا ہے یعنی جن میں کوئی اصلاح کا پہلو موجود ہے۔ ہر ایک شاعر اور افسانہ نویس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شاعر افسانہ نویس اور ناولسٹ ہونے سے پہلے پیغمبر واعظ اور خطیب ہو۔ اسکی ہر کہانی سبق آموز اور ہر نظم نتیجہ خیز ہو۔ چنانچہ اگر ناول لکھے تو یہ ضرور دکھائے کہ نیک آدمی کو نیکی کی جزا ہر حال میں ملتی ہے اور بدمعاش اپنے جرم کی پاداش میں ضرور پھانسی کے تختہ پر لٹکایا

جاتا ہے۔ اگر وہ افسانے لکھتا ہے تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ ہندوستانی بیوی اپنے بدکار خاوند کی خباثت کے باوجود اس سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اگر وہ شاعر ہے تو وہ ہر مذہبی اصول کو اپنی نظم کا موضوع بنائے۔

۴

اپنے ملک کی فلمیں بھی عجیب ہیں۔ پندرہ پندرہ ہزار فٹ لمبی کہانیوں میں نہ تسلسل نہ پلاٹ۔ ہر ایک تصویر میں وہی ہیرو وہی ہیروئن۔ ایک درجن کے قریب گانے۔ پانچ چھ ناچ۔ بوس و کنار کے بغیر محبت۔ بے ربط مکالمے۔ بے معنی گیت۔ غیر قدرتی انجام۔ واقعی یہ عجیب ملک ہے جہاں ڈائرکٹر کہانی لکھنے کے علاوہ گانے اور مکالمے بھی خود لکھتا ہے۔ ہیرو کا پارٹ بھی خود ادا کرتا ہے۔ اور دو تین بار ہیروئن سے جھوٹ موٹ بیاہ رچانے کے بعد واقعی اس سے شادی کر لیتا ہے۔

۵

اپنے وطن میں فحش اشتہارات کی بھی افراط ہے۔ دیواروں پر درختوں کے تنے کے ساتھ۔ نوٹس بورڈوں پر یہ اشتہار جلی قلم میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جگہ

ان اشتہارات سے بچی ہے تو وہ آسمان ہی ہے۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر ایک غیر ملک کا باشندہ یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہندوستان کا بچہ بچہ جنسی امراض میں مبتلا ہے۔ معزز سے معزز اخبار میں یہ اشتہار نمایاں جگہ پر شایع کئے جاتے ہیں مگر ہم سب اِن سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ ہمارا بڑے سے بڑا لیڈر بھی ان کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔

۶

اپنے وطن میں ہر اکیلی نوجوان لڑکی یا عورت شک کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ اکیلی سیر کو جا رہی ہے تو شکار پھانسنے کے لئے جا رہی ہے۔ اگر وہ اکیلی سفر کر رہی ہے تو ضرور حسن فروش ہے۔ اگر وہ تن تنہا سکونت پذیر ہے تو ہم اُس پر گھناؤنے سے گھناؤنا الزام لگانے میں حق بجانب ہیں۔ اگر وہ کسی ایسے آدمی سے بات چیت کر رہی ہے جو اسکا باپ یا بھائی نہیں تو ضرور اس سے اظہار محبت کر رہی ہے۔ اگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ اگر وہ اندھیرے میں کہیں جا رہی ہے تو ضرور اپنے عاشق کے گھر جا رہی ہے۔ اور اگر وہ تاریکی میں کہیں سے

آ رہی ہے تو اپنے آشنا کے گھر سے آ رہی ہے۔ چونکہ اپنے وطن میں سوائے طوائف کے ہر ایک عورت غلام ہے اسلیئے ہر آزاد خیال عورت پر ہمیں طوائف کا شبہہ ہوتا ہے۔

۷

واقعی اپنے وطن میں سب کچھ ہے ----- نفاق، جہالت، غلاظت، مذہبی جنون، ہمارے اسٹیشنوں کے مسافر خلنے، ہمارے ہوٹل، ریل گاڑیاں غلاظت سے پُر ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے تحمل کا یہ حال ہے کہ ہم سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں کیونکہ ہمیں مسافر خلنے یا ہوٹل میں صرف ایک آدھ گھنٹہ ٹھہرنا ہے اسلئے اگر وہ گندے بھی ہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ہمارے مذہبی جنون اور جہالت کی یہ حالت ہے کہ ہم جاہل سے جاہل مولویوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے کو تیار رہیں وہ جس طرح ہمیں نچاتے ہیں ہم ناچتے ہیں۔ نہ صرف ناچتے ہیں بلکہ انکے اشاروں پر ناچنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کیونکہ "مسجد کے سامنے ہندوؤں نے باجہ بجایا ہے اسلئے ہندو کشتنی ہیں۔ حالانکہ ابھی ابھی انگریزی پلٹن کا بینڈ قیامت برپا کرتا ہوا مسجد کے سامنے سے گذرا تھا، ابھی جس وقت مولوی صاحب نہایت انہماک کے ساتھ نماز ادا

کررہے تھے۔ کیونکہ اس مسلمان نے گائے ذبح کی ہے اسلئے اسکی گردن اڑا دو، حالانکہ ہر روز انگریزی چھاؤنیوں میں فوجیوں کے لئے ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اپنے وطن میں مذہبی پیشوا ہمیشہ مزے میں اور مذہب ہمیشہ خطرے میں ہوتا ہے۔ مذہب کا اپنے وطن میں بہترین استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم کو لڑوایا جاتا ہے۔ مذہب کی بدولت فرقہ وارانہ فسادات کروائے جاتے ہیں تو اسی کی بدولت اور غلامی کی زنجیروں کو مضبوط بنایا جاتا ہے تو وہ بھی اسی کی بدولت۔ عجیب بات یہ ہے کہ متعدد بار زک اٹھانے کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہمیں الو بنا رہے ہیں۔

۸

مگر کہاں تک ذکر کیا جائے کہ اپنے وطن میں کیا کیا ہے اور کیا کیا نہیں۔ اپنے وطن میں سڑکیں ہیں جن پر رات کو کبھی روشنی نہیں ہوتی اور جن پر دن میں کبھی چھڑکاؤ نہیں ہوتا۔ ایسے جوتشی اور عامل ہیں جنھیں یہ معلوم نہیں کہ آج ہفتے کا کون سا دن ہے مگر جو ہر وقت بتا سکتے ہیں کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ ایسی دکانیں ہیں جو عین بدررو کے اوپر واقع ہیں مگر جہاں

اشیا خریدنے میں کسی کو عذر نہیں۔ ایسے مغرب پرست انسان ہیں جو دروازے اور روشن دان بند کر کے اپنی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ ایسی کم سن بیوائیں ہیں جنھوں نے اپنے خاوند کا چہرہ تک نہیں دیکھا... ایسے سیاست داں ہیں جن کے نزدیک سیاست دانی کی انتہا چرخہ کاتنے میں ہے ...... اینگلو انڈین مصنفوں کی نظر میں ہندوستان مہاراجوں ہاتھیوں اور سپیروں کا ملک ہے۔ حالانکہ اچھی طرح دیکھا جائے تو یہ نقالوں، غداروں اور کنگالوں کا وطن ہے۔

اپنے وطن میں محبت گناہ ہے اور عشق حرام۔ مذہب پر جائز اعتراض کرنا کفر ہے اور پرانی روش کو چھوڑنا غداری۔ صرف ایک چیز اپنے وطن میں نہیں اور وہ ہے خوبصورت عورتیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے راجاؤں، نوابوں اور شعرا کو خوبصورت عورتیں لانے کے لئے پیرس اور لندن جانا پڑتا ہے۔ اس چیز کے علاوہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے۔ ابوالاثر بجا فرماتے ہیں ؎

اپنے وطن کے دن رات نیارے ٭ باغ اور آکاش پھول اور ستارے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

۱. تنقید کا مفہوم و منصب
۲. ڈراما انارکلی کے نمائندہ کردار
۳. انشائیہ کی تعریف اور امتیازی خصوصیات
۴. جموں و کشمیر میں اردو ناول کا آغاز و ارتقا